آب گم

مشتاق احمد یوسفی

۱۹۹۹ء

- غنودیم' غنودیم

مشتاق احمد یوسفی

"احسان بھائی! منور حسین بھی رخصت ہو گئے۔ انتقال سے پہلے۔"
"کس کے انتقال سے پہلے؟" میاں احسان الٰہی نے اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کے پنکھے کو تکتے اور فالج زدہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔
انہیں رہ رہ کر اپن جائنا کے درد کا شبہ ہو رہا تھا۔
یہ جنوری ۱۹۸۷ء کا ذکر ہے' مجھے اپنا مدعا بیان کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔
میاں احسان الٰہی پانچ سال سے صاحب فراش تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ امراض قلب کے ہسپتال میں دس بارہ دن "کوما" میں رہے۔ جب ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا آدھا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ بینائی جاتی رہی۔ قوت گویائی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ حافظہ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ صرف تکلیف دہ باتیں یاد رہ گئیں۔
اگر اب انہیں کوئی پہلی بار دیکھتا تو یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سوا چھ فٹ' دو سو دس پونڈ اور پہلوانی ڈیل ڈول والا شخص ہے جو بہتر سال کی عمر میں صبح چار بجے ڈیڑھ گھنٹے ڈنڑ بیٹھک لگاتا' پھر ایک گھنٹے ٹینس کھیلتا اور دن میں چار پانچ میل پیدل چلتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں دل کے پہلے شدید دورے کے بعد انہوں نے بد پرہیزی' بیٹھکوں اور بزم آرائیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لندن گئے تو ابن حسن برنی کی طرح انہیں بھی کہیں

کوئی زینہ نظر آ جاتا تو اس پر چڑھتے ضرور تھے۔ کہتے تھے ”اس سے دل قوی اور بڑھاپا پسپا ہوتا تھا۔ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے چنیوٹ کے نواح میں کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں نہ چڑھا ہوں۔“ ڈاکٹروں نے غذا میں سخت پرہیز کی تاکید کی۔ انہوں نے چنیوٹ سے اصلی گھی اور آم کا اچار منگوانا تو چھوڑ دیا لیکن چنیوٹی کنا' سندھی بریانی' برنس روڈ کی ترترائی نافتان' کوئٹہ کے سجی کباب' بادام کی حیدر آبادی لوزات' ملتان کے انور رٹول۔ مختصر یہ کہ دل کے مریض کے لیے خودکشی کے نسخے کے جملہ اجزاء نہیں چھوڑے۔ خود ہی نہیں اپنے معالجوں کو بھی گھر بلا کر بڑے شوق اور اصرار سے کھلاتے۔ کہتے تھے' لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بدستور اپنے خلاف وضع طبی معمولات پر قائم رہے۔ روزے بھی نہیں چھوڑے کہ بچپن سے رکھتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح پنج وقتہ نماز اب بھی باقاعدگی سے قضا کرتے تھے۔ تاویل یہ پیش کرتے کہ اب شروع کروں تو لوگ کہیں گے' میاں صاحب ایک ہی ہارٹ اٹیک میں اٹھک بیٹھک کرنے لگے۔ ذیابیطس بھی ہو گئی۔ لیکن سونے سے پہلے ایک پاؤ فل کریم والی آئس کریم ضرور کھاتے۔ جتنے ذہین تھے' اس سے زیادہ خود رائے۔ ہر مسئلہ پر' خواہ طبی ہی کیوں نہ ہو' وہ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ کہتے تھے آئس کریم قلب کو ٹھنڈک پہنچاتی اور بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتی ہے' بشرطیکہ مقدار قلیل نہ ہو۔ سرگودھا یا ساہیوال اپنے سمدھیانے جاتا ہوں تو تکلف میں رات کو آئس کریم کا ناغہ ہو جاتا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جس رات آئس کریم نہ کھاؤں اس رات مچھر بہت کاٹتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں آپ کو معلوم ہے' یورپ کی سیاحت پر گیا تھا۔ کئی دن تک بریانی نہیں ملی۔ چنانچہ ویانا میں ہرنیا کا آپریشن کرانا پڑا۔ آپ میرے چٹورپن اور بدپرہیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ غالب کو دیکھیے۔ ساری عمر ناقدری اور عسرت و تنگ دستی کا رونا روتے رہے۔ خصوصاً آخری دنوں میں۔ لیکن ذرا مرض الموت میں ان کی آخری غذا تو ملاحظہ فرمایئے۔ صبح کو سات بادام کا شیرہ' قند کے شربت کے ساتھ۔

دوپہر کو سیر بھر گوشت کی یخنی۔ تین شامی کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ بھائی میرے! یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے‘ سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے۔ لیکن مجھے تو مرض الموت کے بغیر بھی اتنی کیلوریز میسر نہیں۔ اور ہاں‘ شراب کے ضمن میں بادہ پرتگالی کے بجائے خانہ ساز کی شرط توجہ طلب ہے۔ علاوہ ازیں صرف پانچ روپے بھر شراب غالباً اس لیے پیتے تھے کہ اگر اس کی مقدار بڑھا دیتے تو پھر اتنا ہی عرق شیر بھی زہر مار کرنا پڑتا۔ بھائی میرے‘ میں تو دودھ کی آئس کریم صبر و شکر سے کھاتا ہوں۔ کبھی تولہ ماشہ کی قید نہیں لگائی۔“

ڈاکٹروں سے ایکس رے اور مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اکثر بائیو کیمسٹری سے خود اپنا علاج کرتے۔ ایسی قوت ارادی کے مالک اور ایسے بقراط مریض پر ڈاکٹر کو بھی غصہ نہیں آتا‘ ترس اور پیار آتا ہے۔ حلقہ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل ان کے رخسار ہی میں نہیں فقروں میں بھی پڑتا تھا۔ بالآخر ان کی بدپرہیزی اور لاجواب کر دینے والی منطق کا نتیجہ شدید فالج کی شکل میں رونما ہوا۔

میں ڈرائنگ روم اور برآمدے سے ہوتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا تو دیکھا کہ ان کے میوزک روم میں (جس میں نو دس لاؤڈ سپیکر اس خوبی سے لگائے گئے تھے کہ ایک بھی نظر نہیں آتا تھا) تالا پڑا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری بھی‘ جس کی سینکڑوں کتابوں کی قیمتی جلدیں انہوں نے نظام دکن کے شاہی جلد ساز سے بطور خاص بنوائی تھیں‘ چار سال سے بند پڑی تھی۔ اسی لائبریری میں انہوں نے میرا تعارف نیاز فتح پوری‘ مولانا محمد ایوب دہلوی‘ محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے کرایا تھا۔ اور یہیں سے انہوں نے ایک دفعہ آدھ گھنٹے تک مجھے فون پر استاد بندو خاں کی سارنگی سنوائی تھی کہ وہ اپنے ہر شوق اور لطف میں دوستوں کو شریک کرکے اپنی خوشی دوبالا کرنے کے رمز سے واقف تھے۔

فون پر سارنگی سنوانے کا قصہ یہ ہے کہ ان کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر میں تاش‘ پرائی عورتوں کے فوٹو (مراد ایکٹرسوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے تو

خلاف تھے ہی، گانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔ "بیٹا جی! موسیقی حرام تو ہے ہی، منحوس بھی ہوتی ہے۔ جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگرو بج گئے، اس گھر کے

سامنے ایک نہ ایک دن دوالے اور قرقی کا ڈھول بجنا لازمی ہے۔ وہ گھر اجڑے ہی اجڑے۔ اسے میری وصیت جانو۔" وصیت کے احترام میں میاں احسان الٰہی اس مترنم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے۔ لیکن الحمدللہ مرحوم کی پیش گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے کبھی قرقی کا ڈھول نہیں بجا۔ کسی بھی گھر کے سامنے نہیں بجا جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کیے۔ میاں احسان الٰہی اپنے گھر میں موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے۔ اول، گانے والی زندہ حالت میں نہ ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے گانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو۔ دوم، ان کے گھر میں گانے والا بالکل تنہا گائے۔ یعنی نہ طبلے کی سنگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو۔ نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ گانے کے بول سمجھ میں آ جائیں گے۔ یعنی راگنی پکی ہو۔ سوم، گانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے۔ مطلب یہ کہ گانے والا فی سبیل اللہ گلوکاری کرے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی وہ والد مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے، موسیقی ہرگز نہیں۔

میاں احسان الٰہی اس وقت کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی دلائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔ دائیں دیوار پر عالم جوانی کی دو تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے، دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کندہ) مردہ نیل گائے کی تھوتھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں تصویروں کے نیچے ان کی نئی ان ویلڈ چیئر (معذوروں کی کرسی رواں) رکھی تھی۔ ان کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں سجی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔ اس وقت تو ان کے حافظہ کا قائل ہونا پڑا اس لیے کہ انہوں نے

میری تواضع کے لیے فریسکو سے میری پسندیدہ گرم جلیبیاں اور ناظم آباد کے ملا حلوائی کے گلاب جامن منگوائے تھے۔ دائیں طرف دیوار سے لگے ساگوان کے کنگ سایز بیڈ پر تکیے نہیں تھے۔ ان کی بیگم کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے کارنس پر ایک چھوٹا سا کیسٹ پلییَر اور ان مشاعروں کے ٹیپ رکھے تھے جو گزشتہ پینتیس برسوں میں اس لان پر ہوئے تھے جس کے لیے گھاس ڈھاکہ سے' گلاب اور پام کے درخت پنڈی اور سری لنکا سے منگوائے تھے۔ فالج کے پیش نظر پنکھا' ایئر کنڈیشنڈ' کھڑکیاں' بری خبروں کی اطلاع' بچوں کا داخلہ' سب بند تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ ان کی سماعت بھی متاثر ہو چلی ہے۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں دہرایا۔

"ہمارے یار جانی منور حسین مر گئے۔"

"ہاں' مجھے کسی نے بتایا تھا۔" انہوں نے بڑی لکنت سے کچھ کہا جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ میری بات پر وہ اپنی توجہ بیس پچیس سیکنڈ سے زیادہ فوکس نہیں کر پا رہے تھے اور حاضر دماغی کے اس مختصر سے کوندے میں اپنا مدعا بیان کرنے میں مجھے خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بات یہ تھی کہ اٹھائیس سال کراچی میں رہنے کے بعد میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن جانے کے لیے رخت سفر باندھا تو پہلے اپنے دوستوں (جن کے نام رسمی خانہ پری کی خاطر میاں احسان الٰہی اور منور حسین فرض کر لیجئے' نام میں کیا رکھا ہے' دوست کو کسی بھی نام سے پکاریں' گلوں ہی کی خوشبو آئے گی) کی باتیں اور یادیں انہیں کی زبانی ٹیپ پر محفوظ کیں۔ مفصل نوٹ بھی لیے۔ ان یادداشتوں پر مبنی و مشتمل دس خاکے اور مضامین لندن میں بڑی تیز قلمی سے لکھ ڈالے اور حسب عادت پال میں لگا دیئے کہ ڈیڑھ دو سال بعد نکال کر دیکھیں گے کہ کچھ دم ہے بھی یا نرے سوختنی ہیں۔ میاں احسان الٰہی اور منور حسین سے دوبارہ ان کی اشاعت کی اجازت چاہی جو انہوں نے

بخوشی اور غیر مشروط طور پر دے دی۔ میں نے صاف کرنے کے لیے مسودہ نکال کر دیکھا تو ایک عجیب کیفیت سے دو چار ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ کسی اور نے

لکھا ہے۔ یہ بھی بالکل عیاں تھا کہ یہ دو کتابوں کا مواد ہے۔ میں ایک مسودے سے دو کتابیں برآمد کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ منور حسین کا ایک مختصر سا خط موصول ہوا' جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے تو ذاتی طور پر کوئی تامل یا اعتراض نہیں' لیکن ممکن ہے اس کی اشاعت میرے اعزہ و اقربا کو اچھی نہ لگے۔ لہٰذا ان باتوں اور یادوں کو میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ میں کراچی جا کر ان سے اس موضوع پر مفصل گفتگو کروں' دو تین مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میری روداد سن کر میاں احسان الٰہی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ پھر کہنے لگے' بہت دن ہو گئے۔ اب پاکستان آ بھی جایئے۔ ہمارے بعد آئے تو کیا آئے۔ بینائی بالکل جاتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ 37 سال میں' میں نے انہیں دوسری بار روتے دیکھا۔

اب میں عجیب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ دونوں کی یادیں اور باتیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح گتھی اور گندھی ہوئی تھیں کہ ان جڑواں سیاسی تحریروں کو بے ضرر عمل جراحی سے علیحدہ کرنا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک کے نام' مقام اور شناختی کوائف کا تو انکشاف کر دوں اور دوسرے کی تلبیس لباس کرکے افسانوی لبادہ پہنا دوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سارے مسودے کو یک قلم مسترد کر کے نہ صرف نام اور مقام بدل دوں' بلکہ اول تا آخر سب کچھ Fictionalise کر دوں' جس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ ہوا۔ اور میں نے یہی کیا۔

چنانچہ "آب گم" کے پانچ کہانی خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے' اس کا ان دوستوں کے واقعات زندگی یا ان کے احباب' بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی مماثلت

نہیں ہے۔ مودبانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار "اصلی" نظر آئے تو اسے محض سوء اتفاق تصور فرمایئے۔ تمام تر واقعات و کردار فرضی ہیں۔ البتہ جن مشاہیر کا ذکر جہاں کہیں "بہ بدی" یا بر بنائے تنقیص آیا ہے' اسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے حتی الامکان منور حسین اور میاں احسان الٰہی کے مخصوص پیرایہ بیان اور انداز گفتگو کی لٹک' اور کہیں کہیں آپس کی نوک جھونک کے دوران شرار جستہ و فقرۂ برجستہ کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فکشن ہے یا سچی واردات یا ان دونوں کا ملغوبہ جسے آج کل Faction (Fact+Fiction) کہا جاتا ہے۔ ایک چینی دانا کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا سفید۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔

اس پس منظر کا ذکر و وضاحت مجھ پر اس لیے بھی واجب ہے کہ اس کتاب کا اصل محور' محرک اور باعث تصنیف ہر دو یاران رفتہ کی صحبت اور مطائبات تھے جو میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ صحبت یاراں میں ہر لمحے کو ایک جشن سمجھ کر گزارتے تھے۔ اس قرض اور نعمت عظمٰی کا اخفا بددیانتی ہو گی۔

جس اکھڑی اکھڑی گفتگو کا اوپر ذکر آیا ہے' اس کے کچھ ہی دن بعد میاں احسان الٰہی بھی اپنے رب سے جا ملے اور دیس سونا کر گئے۔ اور اب میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کی زیر زر پرستی گیارہ سال لندن میں گزارنے کے بعد وطن کو مراجعت کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان کا گلہ اور خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذاتی' ادبی' پیشہ ورانہ' سیاسی اور قومی اعتبار سے اس عشرۂ رایگاں میں زیاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ پایا۔ البتہ ملکوں ملکوں گھومنے اور وطن سے دور رہنے کا ایک بین فائدہ یہ دیکھا کہ وطن اور اہل وطن سے محبت نہ صرف بڑھ جاتی ہے بلکہ بے طلب اور غیر مشروط بھی ہو جاتی ہے۔

سفر کردم بہر شہری دویدم
بہ لطف و حسن تو کس را ندیدم

نقصان یہ کہ ہر خبر اور افواہ جو ادھر سے آتی ہے' دل دہلانے اور خون جلانے والی ہوتی ہے۔
پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ یہ عمل دس گیارہ سال تک جاری رہے تو حساس آدمی کی کیفیت سیسمو گراف کی سی ہو جاتی ہے' جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری سیاست کا قوام ہی آتش فشاں لاوے سے اٹھا ہے۔

دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری

لیڈر خود غرض' علماء مصلحت بیں' عوام خوفزدہ اور راضی برضائے حاکم' دانشور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں (رہے ہم جیسے لوگ جو تجارت سے وابستہ ہیں تو' کامل اس فرقہ تجار سے نکلا نہ کوئی) تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزما آمر ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے۔ ڈکٹیٹر خود نہیں آتا۔ لایا اور بلایا جاتا ہے۔ اور جب آ جاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے سے زیادہ غبی اور تابعدار اونٹ تلاش کرکے اسے دعوت دینے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں تا کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں۔ اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تبرا بھیج سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈکٹیٹر سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس معنی میں کہ وہ خلوص دل سے یہ سمجھتا ہے

کہ ملک و ملت سے جس طرح ٹوٹ کر وہ محبت کرتا ہے اور جیسی اور جتنی خدمت وہ تن تنہا کر سکتا ہے' وہ پوری قوم کے بوتے کا کام نہیں۔ وہ سچ مچ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہی نہیں' درماں بھی ہے۔ نیز اسی کی ذات واحد خلاصہ کائنات اور بلا شرکت غیرے سر چشمہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اس کا ہر فرمان بمنزلہ صحیفہ سماوی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ فرامیں خیال میں

اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس ان لا مسائل (Non-Issues) اور فرضی قضیوں کا نہایت اطمینان بخش حل ہوتا ہے جو وہ خود اپنی جودت طبع سے گھڑے کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اخباری معمے (کراس ورڈ) بنانے والوں کی طرح پہلے وہ بہت سے حل اکٹھے کر لیتا ہے اور پھر اپنے ذہن معمہ ساز کی مدد سے ان سے آڑے ترچھے مسائل گھڑتا چلا جاتا ہے۔

رائے کی قطعیت اور اقتدار کی مطلقیت کا لازمی شاخسانہ یہ کہ وہ بندگان خدا سے اس طرح خطاب کرتا جیسے وہ سب پتھر کے عہد کے وحشی ہوں۔ اور وہ انہیں ظلمت سے نکال کر اپنے دور ناخدائی میں لانے اور بن مانس سے آدمی اور آدمی سے انسان بنانے پر مامور من اللہ ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنی شیشہ پلائی ہوئی دیوار سے خطاب کرتا رہتا ہے مگر قد آدم حروف میں اس پر لکھا ہوا نوشتہ اسے نظر نہیں آتا۔ مطلق العنانیت کی جڑیں دراصل مطلق الانانیت سے پیوست ہوتی ہیں۔ چنانچہ اوامر نواہی کا انحصار اس کی جنبش ابرو ہوتا ہے۔ انصاف کی خود ساختہ ترازو کے اونچے نیچے پلڑوں کو اپنی تلوار کا پاسنگ کبھی اس پلڑے اور کبھی اس

پلڑے میں ڈال کر‘ برابر کر دیتا ہے۔ ”ہر کہ آمد عدالت نو ساخت“
ایسی سرکار دولت مدار کو ما بدولت مدار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ نقل کفر‘ کفر نہ باشد‘

مرزا عبدالودود بیگ تو (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور آخر میں اتنی ہی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے میں اپنے کان پکڑتے ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے میں تو جب اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رجیم سے یہی Regime مراد ہے! نعوذ باللہ۔ ثم نعوذ باللہ۔

پھر جیسے جیسے امور سلطنت پر وفور تمکنت اور ہوس حکمرانی غالب آتی ہے‘ آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے اور جو اس کے دست آہن پوش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتا ان پر اللہ کی زمین کا رزق‘ اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ ادیبوں اور تلامیذ الرحمٰن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور قبیلہ ہوتا ہے جسے مافی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کراتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں۔ مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے‘ جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے۔ قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ وزن‘ بحر اور عقل سے خارج ہو تب بھی ہم خارج نہیں ہوں گے۔ بامتثال امر‘ قصائد نو کے انبار لگ جاتے ہیں۔

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

جیسے اور دور گزر جاتے ہیں‘ یہ دور بھی گزر گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہے کہ نہ جانے پھر کب اور کدھر سے نکل آئے۔
کبھی کسی نے گولی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو

معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی اور غیر منصبی حالت سجود ہی میں ادا کرنے کے عادی و

خوگر ہو گئے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔

ارجنٹائن ہو یا الجزائر' ترکی ہو یا بنگلہ دیش یا عراق و مصر و شام' اس دور میں تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ سیٹ' مکالمے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔

متذکرہ صدر دس تحریریں' جو اپنی ساخت' ترکیب اور دانستہ و آراستہ بے ترتیبی کے اعتبار سے مونتاژ اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ناول سے زیادہ قریب ہیں' اسی دور ضیاع کا تلخاب ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ اس کتاب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے امینول جوزف سائیز سے پوچھا کہ آپ نے انقلاب فرانس میں کون سا شاندار کارنامہ انجام دیا تو اس نے جو سہ لفظی جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ "J'ai Vecee (I survived) یعنی میں اپنے آپ کو بچا لے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں میں خود کو اپنے آپ سے بھی بچا پایا یا نہیں۔ وطن اور احباب سے گیارہ سال دوری اور مجبوری کا جو اثر طبیعت پر مرتب ہوتا ہے' اس کی پرچھائیاں آپ کو جہاں تہاں ان تحریروں میں نظر آئیں گی۔

یوں لندن بہت دلچسپ جگہ ہے اور اس کے علاوہ بظاہر اور کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ غلط جگہ واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی بے آرامی ضرور ہے۔ مثلاً مطلع ہمہ وقت ابر و کہر آلود رہتا ہے۔ صبح اور شام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگ AM اور PM بتانے والی ڈائل کی گھڑیاں پہنتے ہیں۔ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہو۔ گھر اتنے چھوٹے اور گرم کہ محسوس ہوتا ہے کمرہ اوڑھے پڑے ہیں۔ پھر بقول ملک الشعراء فلپ لارکن یہ کیسی مجبوری کہ

"Nowwhere to go but indoors!"

روشن پہلو یہ کہ شائستگی' رواداری اور بردباری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب' سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلاف تہذیب اور انتہائی معیوب حالت

میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ بے حد خوش اطوار اور ہمدرد۔ کار والے اتنے خوش اخلاق کے اکلوتے پیدل چلنے والے کو راستہ دینے کے لیے اپنی اور دوسروں کی راہ کھوٹی کر کے سارا ٹریفک روک دیتے ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ کہ سدا کے جذباتی ٹھہرے، سر راہ اپنی اس توقیر سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے تحاشا جی چاہتا ہے زیبرا لائن پر ہی کھڑے ہو کر پہلے سب کو جھک جھک کر فرداً فرداً کورنش بجا لائیں، پھر سڑک کراس کریں۔ مختصر یہ کہ کنج قفس میں اچھی گزرتی ہے۔

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیاد
بس ایک حشر بپا بال و پر میں رہتا ہے

کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عصر ادیبوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں سو میں سے ننانوے ان خوبصورت درختوں کے نام نہیں بتا سکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے نہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔ (رہا سواں آدمی، سو اس نے درختوں کو کبھی نوٹس ہی نہیں کیا) نہ ان رنگ برنگے پرندوں کے نام جو منہ اندھیرے اور شام ڈھلے ان پر چہچہاتے ہیں اور نہ اس گرل فرینڈ کے بالوں کا شیڈ بتا سکتے ہیں جس کے ساتھ رات بھر بڑی روانی سے غلط انگریزی بولی۔ گولڈن آبرن، کاپر آبرن، ایش بلانڈ، چیسٹ نٹ براؤن، ہیزل براؤن، برگنڈی براؤن؟ ..... کچھ معلوم نہیں۔ ان کی خیرہ نگاہیں 'تو جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لا جواب ہو' کے فلمی مقام پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ غیر ملک کی زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ اور اس کے مسائل کی تفہیم اور گرفت اتنی سرسری اور سطحی ہوتی ہے کہ کبھی میوزیم، آرٹ گیلری، تھیٹر، نائٹ کلب، سوہو کی شب تاب گلیوں کے طواف، ایسٹ اینڈ میں ذلت آمیز "مگنگ" یا چیئرنگ کراس پر گاہک کی منتظر شب زادیوں کی عنایات عاجلہ سے آگے نہیں بڑھ

پاتی۔ بہت تیر مارا تو برطانوی شہریت حاصل کرکے وہ رہی سہی عزت بھی گنوا دی جو ٹورسٹ یا مہمان مزدور کی حیثیت سے حاصل تھی' یا بیک وقت برٹش پاسپورٹ اور "ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام" لینے کی غرض سے کسی انگریز عورت سے شادی کر لی اور اپنے حسابوں سارے انگلستان کی ازار بندی رشتے سے مشکیں کس دیں۔ نک سک اور نسلی اعتبار سے انگریزوں کا "اسٹاک" بہت اچھا ہے۔ قد کاٹھ' رنگ روپ اور تیکھے ترشے نقوش کے لحاظ سے ان کا شمار خوبصورتوں میں ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بد صورت انگریز عورت Rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔ یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے۔ لیکن انگریز عورت کو حبالہ نکاح میں لانے سے نہ تو انگلستان فتح ہوتا ہے' نہ سمجھ میں آتا ہے۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے خود عورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چنانچہ جلا وطن ادیب (خواہ اس نے بہتر تنخواہ اور بدتر سلوک کی خاطر خود کو ملک بدر کیا ہو یا ذاتی اور سیاسی مجبوری کے تحت آسودہ حال جلا وطنی اختیار کی ہو) ہر پھر کر اسی چھوڑی ہوئی منزل اور گزری ہوئی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے جسے مرور ایام' غربت اور فاصلے نے اب آوٹ آف فوکس کرکے گلیمرائز بھی کر دیا ہے۔ جلا وطن وہائٹ روسی ادیب اس کی بہترین مثال ہیں۔ لندن میں مقیم یا آباد اردو ادیبوں کا بھی کچھ ایسا ہی احوال ہوا۔

کوئی ان کی بزم جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

لندن میں اس راندۂ زرگاہ پر کیا گزری اور کیسے کیسے باب ہائے خرد افروز ہوئے' یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کچھ ایسے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں۔ اسے انشاء اللہ جلد ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ "زرگزشت" کی اشاعت کے بعد ارادہ تھا کہ کوچہ

سود خواراں میں اپنی خواری کی داستان آخری باب میں جہاں ختم ہوئی ہے' وہیں سے دوسری جلد کا آغاز کروں گا۔ لیکن درمیان میں لندن' ایک اور بینک' ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف اور "آب گم" آ پڑے۔ کچھ اندیشہ ہائے دور و دراز بھی ستانے لگے۔ مثلاً یہی کہ میرے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز یہ نہ سمجھیں کہ بینکنگ کیرئیر تو محض کیمو فلاژ اور بہانہ تھا۔ دراصل یکم جنوری ۱۹۵۰ء یعنی ملازمت کے روز اول ہی سے میری نیت میں فتور تھا۔ محض مزاح نگاری اور خود نوشت کے لیے سوانح اکٹھے کرنے کی غرض سے فقیر اس حرام پیشے سے وابستہ ہوا (وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حرام پیسے کی صرف ایک ہی شکل ہوا کرتی تھی' سود) دوسری حوصلہ شکن الجھن جو زرگزشت حصہ دوم کی تصنیف میں مانع ہوئی' یہ تھی کہ یہ اردو فکشن ناموں کی شکل میں۔ افسانے اور ناول ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ افسوس' میرے یہاں سوانح کا اتنا فقدان ہے کہ تادم تحریر زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہو گیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ تیسرا سبب خامہ خود بین و خود آرا کو روکے رکھنے کا یہ کہ اس اثنا میں لارڈ کوئنٹن کے تاثرات نظر سے گزرے۔ وہ ٹرینٹی کالج' آکسفورڈ کا پریزیڈنٹ اور بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیئرمین ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں خود نوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں۔ عاجز اس کی ذہانت پر ہفتوں عش عش کرتا رہا کہ اس کی خود نوشت سوانح نو عمری زرگزشت پڑھے بغیر وہ زیرک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ابھی اگلی ظرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست' ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹل جیا ہے۔ زمانی اور مکانی' انفرادی اور اجتماعی۔ جب انسان کو ماضی' حال سے زیادہ

پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر انا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں' بالخصوص جوانی میں ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئین دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یاد ماضی اور فینٹسی میں جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے' ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ حوصلہ مند اور جفاکش لوگ اپنے زور بازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں' اسی طرح وہ زور تخیل سے اپنا ماضی آپ بنا لیتا ہے۔ یادوں کا سر شور دریا دشت امروز میں بہتے بہتے خواب سراب کے آب گم میں اتر جاتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر کہیں ابھرتی گم ہوتی سوت ندیوں اور کہیں کاریزوں کی صورت' خیال بگولوں میں بوئی ہوئی کھیتی کو سینچتا رہتا ہے۔ اور کہیں اچانک کسی چٹان سے چشمہ آب زندگانی بن کے پھوٹ نکلتا ہے۔

کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ' درماندہ اور پست حوصلہ ہو اس کو اپنا ماضی' معکوس اقلیدس تناسب (Inverse Geometrical Ratio) میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے۔ اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا' بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ ماضی تمنائی' اس پاستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں' اپنا جنگل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ناسٹل جیا اسی لمحہ منجمد کی داستان ہے
شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں
تراشتی ہے' یہ اپنے اپنے ذوق' ظرف' تاب' ہزیمت اور

طاقت فرار پر منحصر ہے۔ تصوف' تقشف' مراقبہ' شراب' مزاح' سیکس' ہیروئین' ویلیم' ماضی تمنائی' فینٹسی (خواب نیم روز) جس کو جو نشہ راس آ جائے۔ آرنلڈ نے ہار جانے والے مگر ہار نہ ماننے والے' دھیان دھول میں لت پت مشرق کی ہار سہار کے بارے میں لکھا تھا۔

The East bow'd low before the blast
In patient, deep disdain
She let the legions thunder past
And plunged in thought again.

اور اس مغرور مراقبے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ خواب آور اور گہرا نشہ جو انسان کو حاضر و موجود سے بے نیاز کر دیتا ہے' خود اپنے لہو میں کسی خواب یا خیال کے فشار و آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے خودی میسر آ جائے تو پھر سب گوارا' سب کچھ پذیرا۔

ہزار آشفتگی مجموعہ یک خواب ہو جائے

صاحب مراۃ الخیال سے روایت ہے کہ جب کفر و برہنگی کے الزام میں سرمد کو پابجواں شہادت گاہ لے جایا گیا تو وہ تیغ بکف جلاد کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گویا ہوا "فدائے تو شوم! بیا بیا کہ تو بہر صورتے می آئی من تر خواب می شناسم" پھر یہ شعر پڑھا اور سر تلوار کے نیچے رکھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا' اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی بھی گمبھیر بات کہتا' کلاؤن ہی لگتا تھا۔
کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فولس کیپ اتار کر پھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہنا دیتے ہیں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ کوچہ سود خواراں میں سر پر دستار رہی یا نہیں' تاہم آپ اس کتاب کا موضوع' مزاج اور ذائقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی نخرے چونچلے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ رسوا کی امراء و جان ادا اور طوائفوں سے متعلق منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جناتی زبان میں کرکے انہیں (طوائفوں کو)ان بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔ وہ تو وہ' خود ہم اپنے طرز نگارش و معاش سے توبہ کر لیں کہ آج وہ' کل ہماری باری ہے۔ بہر کیف اس بار موضوع' مواد اور مشاہدات سب قدرے مختلف تھے۔ سو وہی لکھا جو دیکھا۔ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔
قصہ گو قلندر کو اپنی عیاری یا راست گفتاری کا کتنا ہی زعم ہو' اور اس نے اپنا سر کتنا ہی باریک کیوں نہ ترشوار رکھا ہو' بافندگان حرف و حکایت کی پرانی عادت ہے کہ کہانی کا تانا بانا بنتے بنتے اچانک اس کا رنگ' رخ اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہنے والے کو کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ پھر وہ نہیں رہتا کہ جو تھا۔ سو کچھ ایسی ہی واردات اس نامہ سیاہ راقم سطور کے ساتھ ہوئی۔
وانہ ھو اضحک و ابکی۔

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت

نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں

یہ نہ ادعا ہے' نہ اعتذار' فقط گزارش احوال واقعی ہے۔
بحمدللہ میں اپنی طبعی اور ادبی عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیص دونوں سے ایں درجہ مستغنی ہو جاتاہے کہ ناکردہ تک کا اطراف کرنےy میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ اب مجھے "کسے کہ خنداں نہ شد از قبیلہ مانیست" پر اصرار کے باوجود یہ اقرار کرنے میں خجالت محسوس نہیں ہوتی کہ میں طبعۃ اصولاً اور عادتاً یاس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ مزاح نگاری کے باوا آدمی ڈین سوفٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنی سالگرہ کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتمی لباس پہنتا اور فاقہ کرتا تھا۔ مارک ٹوین پر بھی اخیر عمر میں کلبیت طاری ہو گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان مشاہیر محتشم سے تمہاری مماثلت بس اسی حد تک ہے۔ بہرحال' قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی نکل جاتا تھا۔ بعض نامور پہلوانوں کے گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ ہونہار لڑکے کے بزرگ اس کے کان بچپن میں ہی توڑ دیتے ہیں' تا کہ آگے چل کر کوئی نانہجار مخالف پہلوان توڑنے کی کوشش کرے تو ذرا تکلیف نہ ہو۔
مزاح کو میں دفاعی میکنزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں' اس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سے پیدا ہوتا ہے جب کھمبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہاوت یہ بھی سنی کہ بندر پیڑ کی پھننگ سے زمین پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔
"حویلی" کی کہانی ایک متروکہ ڈھنڈار حویلی اور اس کے مغلوب الغضب مالک کے گرد

گھومتی ہے۔ "سکول ماسٹر کا خواب" ایک دکھی گھوڑے' حجام اور منشی سے متعلق ہے۔
"شہر دو قصہ" ایک چھوٹے سے کمرے اور اس میں پچھتر سال گزار دینے والے سنکی آدمی

کی کہانی ہے۔ "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" میں ایک قدیم قصباتی سکول اور اس
کے ایک ٹیچر اور بانی کے کیری کیچور پیش کئے گئے ہیں اور "کار کابلی والا اور الہ دین
بے چراغ" ایک کھٹارا کار' ناخواندہ پٹھان آڑھتی اور شیخی خورے اور لپاڑی ڈرائیور کا
حکایتی طرز میں ایک طویل خاکہ ہے۔ ان میں جو کردار مرکزی' ثانوی یا محض ضمنی حیثیت
سے ابھرتے ہیں' وہ سب کے سب اصطلاحا بہت "عام" اور سماجی رتبے کے لحاظ سے
بالکل "معمولی" ہیں۔ اسی لے خاص التفات اور تامل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے
ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا' سمجھا' پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بد نصیبی ہی کہنا
چاہیے کہ جن "بڑے" اور "کامیاب" لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا' انہیں
بحثیت انسان بالکل ادھورا' گرہ دار اور یک رخا پایا۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جس کثیر
تعداد میں قادر مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں' اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں
بنانے میں اسے خاص لطف آتا ہے' وگرنہ اتنے سارے کیوں بناتا۔ اور قرن ہا قرن
سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے لگنے لگیں تو جاننا
چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ یہ ایسے ہی عام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ ان
کی الف لیلیٰ ایک ہزار ایک راتوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتی کہ "ہے ہر اک فرد
جہاں میں ورق ناخواندہ"
ممکن ہے بعض طبائع پر جزئیات کی کثرت اور "پلاٹ" کا فقدان گراں گزرے۔ میں
نے پہلے کسی اور ضمن میں عرض کیا ہے کہ پلاٹ تو فلموں' ڈراموں' ناولوں اور سازشوں
میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرہ کی زندگی میں دور دور اس کا نشان نہیں ملا۔ رہی جزئیات
نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی نفسہ کوئی عیب نہیں اور نہ خوبی۔ جزئیات اگر محض
خوردہ گیری پر مبنی نہیں' اور سچی اور جاندار ہیں تو اپنی کہانی اپنی زبانی کہتی چلی جاتی
ہے۔ انہیں توڑ مروڑ کر افسانوی سانچے میں ڈھالنے یا کسی آدرشی شکنجے میں کسنے کی ضرورت

نہیں۔ گگول' چیخف اور کلاڈ سیمون زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اپنے کینوس پر بظاہر بڑی لاپروائی سے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ پروست نے ایک پورا ناول ایک ڈنر پارٹی کی تفصیل بیان کرنے میں لکھ دیا جو یادوں کے Total Recall (مکمل باز آفرینی) کی بہترین مثال ہے۔ انگریزی کے عظیم ترین (بغیر پلاٹ کے ناول Ulysses کی کہانی ۱۶ جون ۱۹۱۶ء کو صبح آٹھ بجے شروع ہو کر اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔ یوجین اونیل کے ڈرامے Long Day's Journey Into Night کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ان شاہکاروں کا حوالہ دینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر میری کچھ بات نہیں بنی تو یہ تکنیک کا قصور نہیں' سراسر میری کم سوادی اور بے ہنری ہے کہ پیڑ گنتا رہ گیا' جنگل کا سماں نہ دکھلا سکا۔ آبشار نیاگرا کی ہیبت اور بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنا ضروری ہے۔ میں جتنی بار اوپر دیکھتا ہوں' کلاہ پندار قدموں پر آن پڑتی ہے۔

یہاں ایک ادبی بدعت اور بد مذاقی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے معنی فٹ نوٹ یا قوسین میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً نئی نسل کے پڑھنے والوں کو ان کے معنی معلوم نہیں۔ دوم' خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔ تفصیل اس اجمال پر ملال کی یہ کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور "آمد نامہ" کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈرائنگ لے لی۔ ہر چند کہ اس میں گردان نہیں تھی لیکن مقامات آہ و فغاں کہیں زیادہ نکلے۔ اس میں میٹرک تک میری مہارت صراحی اور طوطا بنانے سے آگے نہ بڑھ پائی۔ اور میں ہر دو اشیاء ڈرائنگ میں اسپیشلائز کرنے سے پہلے بھی بالکل ویسی ہی بنا سکتا تھا۔ ڈرائنگ ماسٹر کہتا تھا کہ تم اپنا نام اتنی محبت اور محنت سے لکھتے ہو کہ تمہاری Lettering (حرف کشی) اتنی خوبصورت ہے کہ تمہیں فیل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اسکیچ کے نیچے یہ نہ لکھو کہ یہ انگور کی بیل ہے تو تمہیں گھونگھی بنانے کے سو میں سے

سو نمبر ملیں گے۔

تین کرم فرما ایسے ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نابلد ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خطوط اور گفتگو میں صرف فارسی اشعار سے میری چاند ماری کرتے ہیں۔ دس بارہ برس تو میں ستائشی حیرت' دوستانہ درگزر اور مودبانہ نافہمی کے عالم میں یہ سب کچھ جھیلتا رہا۔ پھر اوسان درست ہوئے تو یہ وتیرہ اختیار کیا کہ اپنے جن احباب کے بارے میں مجھے بخوبی علم تھا کہ فارسی میں ان کی دست گاہ میرے برابر (یعنی صفر) ہے' انہیں ان کے اشعار سے ڈھیر کرنے لگا۔ اس عمل سے میری توقیر اور رعب فارسی دانی میں دس گنا اضافہ اور لطف صحبت و مراسلت میں اسی قدر کمی ہو گئی۔ اس کتاب میں فارسی کے جو اشعار یا مصرعے جہاں تہاں نظر آئیں وہ ان ہی تین کرم فرماؤں کے بے طلب عطایا میں سے ہیں۔ یہ ہیں درویش بے ریا و ریش برادرم منظور الٰہی شیخ (مصنف در دل کشا اور سلسلہ روز و شب) جو پرسش حال کے لیے بصرف کثیر لاہور سے لندن انٹرنیشنل کال بھی کریں تو پہلے علالت و عیادت سے متعلق فارسی اشعار سناتے ہیں۔ پھر میری فرمائش پر ان کا اردو ترجمہ و تشریح۔ اتنے میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور آپریٹر لائن کاٹ دیتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے محبت' معذرت اور فارسی اشعار سے لبریز خط لکھتے ہیں کہ معاف کیجئے' آپ کا آپریشن کس چیز کا ہوا تھا۔ اور اب طبیعت کیسی ہے۔ جب سے سنا ہے بہت تردد ہے۔ وقت ضائع کرنے پر سعدی نے کیا خوب کہا ہے .... مگر بیدل نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا' واہ وا۔

دوسرے کرم فرما ہیں' ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب کہ جب بھی برٹش لائبریری جاتے ہیں' بک اسٹال سے ایک خوبصورت اور سمجھ میں آنے والا تصویری پوسٹ کارڈ خریدتے ہیں۔ پھر اس پر فیضی' بیدل یا طالب آملی کے شعر سے پانی پھیر کر مجھے پوسٹ کر دیتے ہیں۔ اور تیسرے ہیں حبیب لبیب و صاحب طرز ادیب محبی مختار مسعود جو عاجز کے وسیع و عمیق علمی خلا کو پر کرنے سے ربع صدی سے جٹے ہوئے ہیں۔ اپنے دل پسند موضوعات پر گھنٹوں ہمارے آگے بین بجاتے اور مجبوراً خود ہی جھومتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان سے

پوچھا، حضور والا، آپ کو یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں۔ مگر وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ خود ذرا کریڈٹ نہیں لیتے۔ بس آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اور اسی انگلی سے اپنا کان توبہ کے انداز میں پکڑ کر اگر بیٹھے ہوں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ انکسار و استغفار کے مخلوط اظہار کے لیے یہ ان کی ادائے خاص ہے، جس کے دوست دشمن سب قتیل ہیں۔

فارسی اشعار کے جو معنی آپ حواشی میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ ان ہی کرم فرماؤں سے پوچھ کر لکھ دیے ہیں تا کہ سند رہے اور بھول جاؤں تو دوبارہ ان سے رجوع نہ کرنا پڑے۔ خصوصاً مختار مسعود صاحب سے کہ جب سے وہ آر سی ڈی کے سلسلے میں ترکی کے سرکاری پھیرے لگا آئے ہیں وہ مزار پیر رومی کے نواح میں درویشوں کا والہانہ رقص بچشم حیراں دیکھ آئے ہیں، فارسی اشعار کا مطلب ہمیں ترکی کے حوالے سے سمجھانے لگے ہیں۔ یوں تو ہم اپنے ایک اور دیرینہ کرم فرما، پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آسان شعر کو بھی اپنے علم کے زور اور وفور سے ناقابل فہم بنا دیتے ہیں۔

آساں ز توجہ تو مشکل
مشکل ز تجاہل تو آساں

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شعر کی مار آج کل کے قاری سے سہی نہیں جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب وہ بے محل بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان اشعار بے محل نہیں ہوتے۔ ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون (کویا) اپنے گاڑھے لعاب دہن سے فارسی شعر کے گرد بنتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ریشم حاصل کرنے

کا زمانہ قدیم سے ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے۔ کوئے کو ریشم کے زندہ کیڑے سمیت کھولتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ مر نہ جائے' ریشم ہاتھ نہیں لگتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ ائے تو دگنا مزا دیتا ہے۔

خدا ان تین عالموں کے درمیان اس فقیر پر تقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے۔ جب سے میری صحت خراب ہوئی ہے' ان کی طرف سے متردد رہتا ہوں۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔

ایک دفعہ میں نے منظور الٰہی صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوبصورت اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن میری طرح' قارئین کی نئی نسل بھی فارسی نابلد ہیں۔ یوں ہی شد بد اور انکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اردو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کرکے' بند ہونٹوں سے اپنے دلاویز انداز میں مسکرائے۔ فرمایا' مگر بھائی صاحب' پھر مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس پر مرزا کہنے لگے "تم نے اس کتاب میں جو ڈھیر سارے انگریزی الفاظ بے ڈھنگ (مرزا بے ورنگ کا یہی تلفظ کرتے ہیں جو ان کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے) استعمال کئے ہیں' ان پر بھی یہی فقرہ چست کیا جا سکتا ہے۔ انگریز تو دوسری زبانوں کے الفاظ خاص خاص موقعوں پر دانستہ اور مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے پھیکے سیٹھے اور بد مزہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ ریستورانوں میں ان کے نام ہمیشہ فرنچ میں دیے جاتے ہیں۔ فرنچ آج بھی شائستگی اور سوفسٹی کیشن کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ لہٰذا انگریزوں کو کوئی آرٹسٹک یا ناشائستہ بات کہنی ہو تو جھٹ فرنچ فقرے کا گھونگھٹ نکال لیتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہو گا کہ سیمول سیپس (۱۶۳۳-۱۷۰۳) نے اپنی شہرہ آفاق ڈائری

(جس میں اس نے اپنی آوارگیوں اور شبینہ فتوحات کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے) شارٹ ہینڈ میں لکھی تھی تا کہ اس کے ملازم نہ پڑھ سکیں۔ جہاں کوئی ایسا نازک مقام آتا جسے انگریز اپنی روایتی کسر بیانی (Understatement) سے کام لیتے ہوئے' Naughty کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں' تو وہ اس واردات کا اندراج فرنچ میں کرتا تھا۔ لیکن جہاں بات اتنی ناگفتنی ہو جو کہ اکثر ہوتی تھی کہ فرنچ زبان میں سلگ اٹھے تو وہ اس رات کی بات کو بلا کم کاست ہسپانوی زبان میں قلمبند کرتا تھا۔ گویا یہ ہوئی لسانی درجہ بندی اعتبار مدارج بوالہوسی۔ اب ذرا علوم کی طرف نگاہ کیجئے۔ انگریزوں نے درختوں اور پودوں کے نام اور بیشتر قانونی اصطلاحیں جوں کی توں لاطینی سے مستعار لی ہیں۔ دانائی کی باتیں وہ بالعموم یونانی زبان میں الٹے واوین کے اندر نقل کرتے ہیں تا کہ کوئی انگریز نہ سمجھ پائے۔ اوپیرا کے پکے گانوں کے لیے اٹالین اور فلسفہ کی اوق اصطلاحات کے لیے جرمن زبان کو ترجیح دے کر ناقابل فہم کو ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں۔

اس طولانی تمہید کے بعد فرمایا۔ لیکن ہم انگریزی کے الفاظ صرف ان موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جہاں ہمیں یقین ہو کہ اس مفہوم کو اردو میں کہیں بہتر طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس بر وقت تنبیہہ کے باوجود آپ کو انگریزی الفاظ جا بجا نظر آئیں گے۔ سبب یہ کہ یا تو مجھے ان کے اردو مترادفات معلوم نہیں۔ یا وہ کسی رواں دواں مکالمے کی بنت میں پیوست ہیں۔ بصورت دیگر بہت مانوس اور عام ہونے کے علاوہ اتنے غلط تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں کہ اب انہیں اردو ہی سمجھنا چاہیے۔ کوئی انگریز انہیں پہچاننے یا اپنانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

"سکول ماسٹر کا خواب" اور "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" پر محب و مشفق دیرینہ محمد عبدالجمیل صاحب نے بکمال لطف و توجہ نظر ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جیسے نفاست پسند اور منکسر المزاج وہ خود تھے۔ ویسے ہی دھیمے ان کے اعتراضات جو انہوں

نے میرے مسودے کے حاشئے پر اتنی ہلکی پنسل سے نوٹ کئے تھے کہ انگلی بھی پھیر دیں تو مٹ جائیں۔ کچھ ایسی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی جن کی اصلاح پر خامہ ہذیاں رقم کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک ترش مکالمے کے دوران گجراتی سیٹھ سے کہلوایا تھا۔ "ہم اس سالے لنگڑے گھوڑے کو لے کے کیا کرے گا؟" جمیل بھائی کی لکھنوی شائستگی اس کی متحمل نہ ہوئی۔ تادیباً پورا جملہ تو نہیں کاٹا' صرف سالے کو قلم زد کرکے اس کے اوپر برادر نسبتی لکھ دیا۔ پھر فرمایا کہ "حضرت! یہ ہک دک کیا ہوتا ہے؟ ہکا بکا لکھیے۔ ہمارے یہاں ہک دک نہیں بولا جاتا۔" عرض کیا "ہکا بکا میں صرف پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منہ نظر آتا ہے' جبکہ ہک دک میں ایسا لگتا ہے جیسے دل بھی دھک سے رہ گیا ہو۔" فرمایا "تو پھر سیدھے سبھاؤ دھک دھک کرنے لگا کیوں نہیں لکھتے؟ اور ہاں مجھے حیرت ہے کہ ایک جگہ آپ نے لوطی لکھا ہے' زلت قلم ہی کہوں گا۔ معاف کیجئے۔ یہ لفظ آپ کے قلم کو زیب نہیں دیتا۔"

پوچھا "تو پھر آپ کے ہاں لوطی کو کیا کہتے ہیں؟"

فرمایا "کچھ نہیں کہتے۔"

میں زور سے ہنس دیا تو چونکے۔ دوسرے پہلو پر خیال گیا تو خود بھی دیر تک ہنستے رہے۔ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ "ایسا ہی ہوتا ہے تو اس کی جگہ "بدتمیز" لکھ دیجئے۔ تہذیب کا تقاضا یہی ہے۔" یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ لفظ (بدتمیز) دوسرے ابواب میں تین چار جگہ ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کیا تھا جو صرف لغوی معنی میں بد تمیزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس نئے مہذب مفہوم کے ساتھ تو وہ مجھ پر بہتان طرازی اور ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلا سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد کلف لگے ململ کے کرتے کی آستین الٹ کر مسودے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے "دواب خانہ' سنگوٹیاں' آر اور جوجھنا شرفائے لکھنؤ نہیں بولتے۔" عرض کیا "میں نے اسی لیے لکھے ہیں۔" پھڑک اٹھے' کہنے لگے "بہت دیر بعد آپ نے ایک

سمجھ داری کی بات کی۔" پھر اس خوشی میں سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے "مگر مشتاق صاحب یہ بوک کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نہیں سنا۔" عرض کیا "جوان اور مست بکرا جس سے نسل کشی کے سلسلے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی داڑھی ہوتی ہے اور جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔ گوشت بھی بساندہ اور ریشے دار۔" فرمایا۔ واللہ' ہم نے یہ لفظ ہی نہیں ایسا بکرا بھی نہیں دیکھا۔ لفظ' مفہوم اور کے گوشت تینوں سے کراہت آتی ہے۔ مقئ ہے۔ آپ اس کی جگہ کوئی اور کم بدبو دار جانور استعمال نہیں کر سکتے؟ کراچی میں اس لفظ کو کون سمجھے گا۔" عرض کیا "وہی جو مقئ (قے آور) کو سمجھے گا۔ آپ تو غالب کے حافظ ہیں۔ آپ کو تو یہ لفظ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ضد کا غالب نے عجیب سیاق و سباق میں ذکر کیا ہے۔ علائی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ تم خصی بکروں کے گوشت کے قلیے اڑا رہے ہو گے۔ لیکن بخدا میں تمہارے پلاؤ قلیے پر رشک نہیں کرتا۔ خدا کرے تمہیں بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا میسر نہ آیا ہو۔ جب یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے تو رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ تحقیق طلب امر یہ کہ اس مصری کی ڈلی سے دراصل غالب کی کیا مراد تھی۔ محض مصری؟ سو وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی' دلی میں منوں دستیاب تھی۔ حیرت ہے محققین و شارحین کی طبع بد گماں ادھر نہیں گئی۔ حالانکہ غالب نے مصری کے تلازمے کو عشق عاشقی کے ضمن میں ایک دوسرے خط میں بھی استعمال کیا ہے۔"

فرمایا "جا چھوڑ دیا حافظ دیوان سمجھ کر۔ لیکن حضرت' یہ روہڑ کس زبان کا لفظ ہے؟ کریہہ الصوت۔ بالکل گنوارو لگتا ہے۔ کیا راجستھانی ہے؟" عرض کیا "خود ہمیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ لہٰذا ہم نے ماجد بھائی سے پوچھا ...."

"کون ماجد بھائی؟"

"ماجد علی صاحب' سابق سی ایس پی۔ لندن منتقل ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے اپنے بیگانے' باس اور ماتحت ...... سب انہیں ماجد بھائی کہتے ہیں' سوائے ان کی بیگم زہرہ نگاہ کے۔

وہ انہیں ماجد چچا کہتی ہیں۔ ان سے رجوع کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ لحاف کی پرانی روئی کو جسے غریب غرباء ہاتھوں سے توم کے دوبارہ استعمال کرتے ہیں' روہڑ کہتے ہیں۔

یوں تو وہ عاجز کے لیے پیر و مرشد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہی ہوتا ہے' تاہم میں نے مزید تشفی کے لیے پوچھا "کیا بداؤں میں بھی بولا جاتا ہے؟" چہرے پر ایک بناوٹی خشونت اور لہجے میں خفیف سی مصنوعی لکنت پیدا کرتے ہوئے' جو بحثا بحثی میں عصائے موسوی کا کام کرتی ہے' بولے "دیکھیے! ذاتی بے تکلفی اپنی جگہ' علمی مباحث اپنی جگہ' بدایوں کو بداؤں کہنے کا حق صرف بدایوں والوں کو پہنچتا ہے۔ مثلاً یوں سمجھیے کہ کل کلاں کو آپ مجھے ماجد بھائی کی بجائے ماجد چچا کہنے لگیں تو لندن پولیس پولی گیمی (تعدد ازواج) میں دھر لے گی' آپ کا تو مزید کچھ نہیں بگڑے گا۔ بہر کیف' روہڑ صحیح ہے۔ بداؤں میں تو پھیری والے گھر گھر صدا لگا کے روہڑ خریدتے تھے اور اس کے بدلے ریوڑیاں دیتے تھے جنہیں اندھے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔" علمی تحقیق و تدقیق سے خود فٹ بال کھیلنے کے مترادف تھا۔ ماجد بھائی کی بذلہ سنجی کے سامنے اچھے نہیں ٹھہر پاتے۔ راوی غیبت بیاں کہتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے باس (وزیر) کے دفتر کے سامنے کچھ دور پر لوگ عزت ماب کے خلاف "ایوب خاں کا چمچہ! ایوب خان کا چمچہ!" کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد بھائی سے پوچھا "یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا۔ "سر' کٹلری کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔"

جمیل صاحب اس طویل تشریح اور معتبر سند سے کچھ پسیجے۔ ناک سے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے بولے "اگر آپ کو صاف روئی سے الرجی ہے تو روہڑ بھی چلے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ متروکات آپ کو بہت فیبی نیٹ کرتے ہیں۔ خیر' مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ کس واسطے کہ مجھے انٹیک جمع کرنے کا شوق ہے۔ لیکن ممکن ہے پڑھنے والوں کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ بریکٹ میں معنی لکھ دیجئے گا۔"

عرض کیا "مرزا اکثر طعنہ دیتے ہیں کہ تم ان معدودے چند لوگوں میں سے ہو جنہوں نے متروکہ جائیداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ چلتے وقت تم اپنے ساتھ متروکات کا دفینہ کھود کر، سموچا ڈھو کر پاکستان لے آئے۔ تفنن بر طرف، اگر ان میں سے ایک لفظ جی ہاں، صرف ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہو گیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی۔"

بولے "پھر وہی"

افسوس! جمیل صاحب صرف دو ابواب دیکھ پائے تھے کہ ان کا بلاوا آ گیا۔ اب ایسا نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس کہاں سے لاؤں جس کا اعتراض بھی نکتہ پروری، استعداد آفرینی اور دل آسائی سے خالی نہ تھا۔

آخر میں اپنی شریک (سوانح) حیات ادریس فاطمہ کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے اپنے تبسم سقم شناس سے بہت سی خامیوں کی نشاندہی کی۔ تاہم بے شمار سخن ہائے سوختنی اور غلطی ہائے مضامین بوجوہ باقی رہ گئی ہوں گی۔ وہ سارا مسودہ دیکھ چکیں تو میں نے کہا۔ "راجستھانی لہجہ اور محاورہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہت دھوتا ہوں پر چنری کے رنگ چھٹائے نہیں چھوٹتے۔

Out, Damned spot! out, I say!

حیرت ہے، اس دفعہ تم نے زبان کی ایک بھی غلطی نہیں نکالی۔

کہنے لگیں۔ "پڑھائی ختم ہوتے ہی علی گڑھ سے اس گھر، گڑھی میں آ گئی۔ تینتالیس برس ہو گئے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی اور تمہاری بولی کیا۔ اب تو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے۔"

ایک دوسرے کی چھاپ، تلک سب چھین کر اپنا لینے اور دریائے سندھ اور راوی کا ٹھنڈا میٹھا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہونا تھا۔ اور جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

• حویلی

○ وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یار طرح دار بشارت علی فاروقی کے خسر کا ہے' لہٰذا تعارف کچھ انہی کی زبانی سے اچھا معلوم ہو گا۔ ہم نے بارہا سنا' آپ بھی سنئے۔

"وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خسر نہیں بنے تھے تو پھوپا ہوا کرتے تھے اور پھوپا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے' مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپور کے رشتے ناطے ابلی ہوئی سویوں کی طرح الجھے اور پیچ در پیچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی' ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی ادھر' آدھی ادھر' چالیس کے لگ بھگ تو ہو گی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپن میں ہوتی تھی' ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ۔ ایسی ویسی؟ بالکل خون کبوتر! لگتا تھا بڑی بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصے میں بھرے رہتے تھے۔ جنے کیوں؟ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغز قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنہیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے' لیکن چہرے پر ایسا

ایکسپریشن لاتے کہ قد آدم گالی نظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار' اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کرکے الٹے اس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے۔ بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے۔ آپ کچھ بھی کہیں' کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں' وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ "نہیں" سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ "آج بڑی سردی ہے" بولے "نہیں' کل اس سے زیادہ پڑے گی۔"

"وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسر ..... لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا' قبول ہے؟ ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مودبانہ ٹھونگیں مار دیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتہ مناکحت کے لیے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کڑک کر بولے۔ "لونڈے' بولتا کیوں نہیں؟" ڈانٹ سے میں نروس ہو گیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے "جی ہاں قبول ہے" کہہ دیا۔ آواز یکلخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھنا رہے تھے کہ اتنے زور سے "ہاں" سے بیٹی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمر ان کا یہی حال رہا۔

اور تمام عمر میں کرب قرابت داری اور قربت قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

حالانکہ اکلوتی بیٹی' بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے لیکن قبلہ نے مائیوں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لیے ابٹن ملا جا رہا تھا' کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو

قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا۔ عقد گاہ انھوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے تو عروسی چھپر کھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ انھوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتی پلاؤ' زردہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو' میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہرگز نہیں بجے گا اور تمھیں رنڈی نچوانی ہے تو Over my dead body' اپنے کوٹھے پر نچواؤ۔

کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہر الٰہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ ان کے گھر بارات چڑھے۔ داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

چہرے' چال اور تیور سے کوتوال شہر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے۔ نکلتا ہوا قد' چلتے تو قد' سینہ اور آنکھیں تینوں بیک وقت نکال کر چلتے تھے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں' اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور کبھی جی کڑا کرکے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبوکا آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ گندمی' آپ جیسا' جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدم' بیک بیوی و دو گوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جھلاتے تنتناتے رہتے۔ مزاج' زبان اور ہاتھ کسی پر قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سے لرزہ براندام رہنے کے سبب اینٹ' پتھر' لاٹھی' گولی' گالی کسی کا بھی نشانہ دائمی طیش نہیں لگتا تھا۔ گچھی گچھی مونچھیں جنہیں گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کو بھی بل دینے لگے۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا۔ چنی ہوئی آستین اور اس سے

بھی مہین چنی ہوئی دو پلی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سلایئی کا چوڑی دار پاجامہ۔ چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علیحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو یہ تصور کرنے کی بھی جرات نہیں کر سکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہو گا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے بنے ہوئے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا چھنچھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بے کار ہو گئے تھے ان کی چابیاں بھی اس گچھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہو گیا تھا۔ محلے میں اس چور کا برسوں چرچا رہا' اس لیے چور صرف تالا' پہرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرہ نسب چرا کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتے دار ہی کر سکتا تھا۔ آخری زمانے میں یہ ازار بندی گچھا بہت وزنی ہو گیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کھل کھل جاتا۔ کبھی جھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامتے۔

مئی جون میں ٹمپریچر ۱۱۰ ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپیڑے پڑنے لگتے تو پاجامے سے ائیر کنڈیشننگ کر لیتے۔ مطلب یہ تھا کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر' سر پر انگوچھا ڈالے' تربوز کھاتے۔ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے' دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے' میاں! یہ تو بزنس پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی! لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آ نکلے تو برا بھلا کہہ کے بھگا دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کھنچا کھنچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لیے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے' ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ فرماتے تھے' داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پر سجتا ہے'

دل اور جوانی۔

○ لفظ کے لچھن اور بازاری پان

تمباکو' قوام' خربوزے اور کڑھے ہوئے کرتے لکھنؤ سے' حقہ مراد آباد اور تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے۔ حلوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ گالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چنری آپ کے جے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب! آپ کا راجستھان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائی تھیں اس آپ نے؟ کھانڈ' سانڈ' بھانڈ' اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا اس کے نام میں ٹھ' ڈ اور ڑ لگا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوبصورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں سچ مچ کی بیوہ کے لیے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوبصورت "نور علیٰ نور" بلکہ "حور علیٰ حور" ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سو سوا سو سال قبل تک رنڈی سے بھی مراد صرف عورت ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں اس لفظ کے لچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی' مہدی حسن اور ریشماں۔

ہاں' تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور بٹوہ رہتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ بازاری پان صرف رنڈوے' تماش بین اور بمبئی والے کھاتے ہیں۔ صاحب' یہ نفاست اور پرہیز میں نے انہی سے سیکھا۔ ڈبیا چاندی کی' نقشین' بھاری' ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈبیا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک یہ پتہ ہی نہیں

چلتا تھا کہ مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بڑے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش' ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے پڑے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ ایک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگا دو تو بٹوہ آپی آپ مصاحبوں کی باچھوں کی طرح کھلتا چلا جاتا ہے۔ گنگا بھوپال سے آتا تھا۔ لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے' میٹھا پان' ٹھمری' گنگا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

ردیف قافیہ سے آزاد شاعری سے بطور خاص چڑتے تھے۔ یوں بھی' بقول شخصے' آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی' آگ' دھوئیں' ہیکڑی' لڑ مرنے' ناکامی اور خواری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورت حال کبھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزلت گزیں اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پہنی۔

○ واہ کیا بات کورے برتن کی!

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری کچھ ان کی زبانی سنئے اور رہی سہی زبان خلق سے' جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور سے پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اس کو آپ ان کا حیلہ معاش اور وسیلہ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلانے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیزم سوختنی کہتے تھے۔ ان کی دکان کو کبھی کوئی ناآشنائے مزاج ٹال کہہ دیتا تو دوسیری لے کر دوڑتے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتھر کے باٹ استعمال کئے۔ فرماتے تھے' لوہے

کے فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتھر کے باٹ کو تو بازوؤں میں بھر کے' سینے سے لگا کے اٹھانا پڑتا ہے۔ اعمال تو دور رہے' کبھی کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ان کے پتھر کے باٹوں ہی کو تلوا کر دیکھ لے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی ریزگاری کو گن کر دیکھے۔ اس زمانے میں یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ "سال" اور چیڑ کا رواج عام تھا۔ بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوا لیے۔ ساگوان تو صرف امراء روسا کی ڈائننگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چارپائی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے' ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر نکالی جاتی تھی۔ اول' جب حکیم' وید' ہومیوپیتھ پیر فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس پر بیٹھ کر وہ جگہ جگہ اسٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے ان حضرات نے اپنی داؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پر کیا ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمی یا مہین لکڑی کی پٹاری میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں یا سولاہیٹ پہنے ڈاکٹر آئے (اور اس کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیمار دار خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اٹھائے) تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کندھا دینے کے لیے تیار کر لیتے تھے۔ در حقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلا کر اس کرسی پر بٹھایا جاتا تھا جب وہ صورت حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں ختنوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا بنا اور مٹی کا کھلونا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس جلادی کرسی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ غریبوں میں اس مقصد کے لیے نئے ماٹ یا لمبی وضع کے کورے مٹکے کو الٹا کر سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

○ چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت‘ نہ گنجائش‘ نہ تک۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کرلی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے‘ بلکہ پھر آرام دہ چارپائی چھوڑ کر‘ کالونیز بنانے کی خاطر‘ گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا۔ ”اوور کولڈ“ سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ رہنے کے لیے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے‘ بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند‘ بے حد پریکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے۔ بولے‘ ادوائن کسنے سے جان چراتے ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری‘ گدیلے‘ قالین‘ جازم‘ چاندنی‘ چارپائی‘ کوچہ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انہیں اسی پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا تو وہ یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

○ اسٹیشن‘ لکڑی منڈی اور بازار حسن میں بجوگ

مقصد اس تمہید غیر دل پذیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ

نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہئے یا ہیزم غیر سوختنی' دھندا اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گاہکوں سے زیادہ تھی۔ لہٰذا کوئی شخص ایسا نظر آ جائے جو حلئے اور چال ڈھال سے ذرا بھی گاہک معلوم ہو تو لکڑ منڈی کے دکاندار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر گاہک گرد و نواح کے دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کانپور آتے تھے۔ ان بچاروں کا لکڑی سے دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک اپنا گھر بناتے وقت دوسرے اپنا کریا کرم کرواتے سمے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے وہ اس چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ہم نے دیکھا کہ دلی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی' جیسے ہی مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا' قلی نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں ادھر اٹھا لیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقے کی چلم پر بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکے سے خود بخود ڈبے سے باہر نکل پڑے' ان کا حشر ویسا ہی ہوا جیسا اردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی جس کے ہاتھ لگی' سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔ دوسرے مرحلے مسافر پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون' سفید قمیص' سفید رومال' سفید کینوس کے جوتے' سفید موزے' سفید دانت۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی' سوائے چہرے کے۔ ہنستے تو معلوم ہوتا توا ہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرے جیسے انگلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلی اور یوپی کے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹونٹی دار لوٹے' مستورات' کثرت اطفال اور قیمے پراٹھے کے بھبکے سے فوراً پہچان لیتے اور "السلام علیکم' Brother in Islam" کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان

دلال ہی دھینگا مشتی کر سکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط ترین حصے پر پڑتا وہی اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا' وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا' اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لا تعداد پہلوان جنہوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کر کے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا خود اس کو چھوڑ دیتے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چیتھڑا اتفاقاً بچ رہا تو اسے بھی نوچ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رام چندر جی کی کھڑاؤں کی طرح سجا دیتے۔ اگر کسی کے چوڑی دار کے کمر بند کا سرا تانگے والے ہاتھ لگ جاتا تو وہ غریب گرہ پہ ہاتھ رکھے اسی میں بندھا چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا کوئی پیچھے سے زلیخائی کرتا۔ آخری راؤنڈ میں ایک تگڑا سا تانگے والا سواری کا دایاں ہاتھ اور دوسرا مسٹنڈا اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر tug of war کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران اور دست اکھیڑ کر لے جائیں' ایک تیسرا پھرتیلا تانگے والا ٹانگوں کے چرے ہوئے چمٹے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو یکلخت اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا اور تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کوپرگنج کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا' جس کے قلب میں قبلہ کی دکان تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق' عقب میں ہوتے تھے۔ گاہک پکڑنے کے لیے قبلہ اور دو تین چڑی مار دکانداروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبن بنا لیے۔ قبلہ کا کیبن مسند' تکئے' حقے' اگالدان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کیبن گویا ایک نوع کا مچان تھا جہاں سے گاہک کو مار کراتے تھے۔ پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو قیافے سے گاہک لگتا' سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکاندار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے "مہاراج! مہاراج!" ان مہاراجوں کو دوسرے دکانداروں کے پنجے سے

چھڑانے اور خود گھسیٹ کر اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھا پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنچایتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف دکاندار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکاندار کے حلقہ تشدد میں داخل ہو گا تو اسے کوئی اور دکاندار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپٹی اور کشتم بچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان کے آگے چونے سے حد بندی کی لائن کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہو گئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکانداروں نے مار پیٹ' گاہکوں کو ہانکا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈول کرکے اندر لانے کے لیے بگڑے پہلوان اور شہر کے چھٹے ہوئے شہدے اور مسٹنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لیے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچ ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازار حسن میں انجام دیتے۔ بہت سی طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور "پمپ" ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یا بد کردار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انہیں زور بازو پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چرائی کٹائی میں مار کٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

○ آلات اخراج خون : جونک' سینگی' لاٹھی

ہمہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیٹتے کہ آنکھ کھلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت ہی

معمولی سی بات پر آ جائے۔ غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو روزہ نہیں رکھنے دیتی تھی۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تازہ پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آ گیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میرے پرانی پریشانیاں ہی کون سی رفع کر دیں جو اب یہ نئی پریشانی دور کرے گا۔ اس رات مصلہ تہہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلئے محلوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف' دنیا جہان کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔ سبزی' گوشت اور سودا سلف کی خریداری' حجامت' تعلیم' زچگی' پڑھی' کھاٹ کھٹولے کی ...... یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی' سب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ بیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لیے نائنیں گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلانیاں گھر آ کر سیتی تھیں تا کہ نامحرموں کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کے زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہمارے نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیٹر بکس کا ناپ لے کر سیئے جا سکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر ہی میں ہو جاتے۔ حد یہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی اس کے لیے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فساد خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا ہجوم دن دیہاڑے بھی رہنے لگے تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکلوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لیے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرہ کرکے لاٹھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانے میں لاٹھی کو آلہ اخراج خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جونک اور لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔

اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی

نوجوان ایسا نہ بچے جس کے جہاں تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی

تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے گا جس کی زبان پر حکیم صاحبان جونک نہ لگوا دیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے۔ قبلہ اولے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلولہ کر رہے تھے کہ اچانک کن میلئے نے کیبن کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی "کان کا میل" خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے تھے جس میں گاہک ان سے تگنے داموں دھڑا دھڑ لکڑی خرید رہے تھے' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تو دہل گئے۔ چق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لیے۔ کمینے کی یہ جرات کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے چیخے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہو گا کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ۔ اس لیے کہ قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتای ہوئی سمت میں دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں' جارحانہ انداز میں لکڑی لاٹھی گھماتا ہرگز نہ جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔

اس وحشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن میلنے کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اڑس رکھے تھے' زمین پر گر گیا۔ اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا۔ نظر بچا کر اسی میں سے تولہ بھر میل نکال کر دکھا دیتا کہ دیکھو یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کسی کے کان سے گولر کے بھنگے برآمد کرکے کہتا کہ تمہارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آوازیں آ رہی تھیں وہ انہیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بھول بھلیوں میں اتنی دور تک سبج سبج سلائی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پگڑ کو چڑھا کر بلی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح گاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبرا ولی عہد' یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن' بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پر ہر خاص و عام کی اطلاع کے لیے بلند کر دیتا تھا۔ اس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھئی' کھٹ بنے' سینگی لگانے والیوں اور سحری کے لیے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کریہہ الصوت موذن بھی عقب والی گلی سے آنے جانے لگا۔

○ کانسی کی لٹیا' بالی عمریا اور چگی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ' محنت اور محبت سے دکھاتے تھے۔ "محبت" کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا کہ وہ گاہک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے' مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساگوان کا تختہ ایسا نہیں تھا جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں (Veins) کا طغریٰ' اگر وہ چاہیں تو یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑی منڈی میں وہ واحد دکاندار تھے جو گاہک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بلی کا شجرۂ نسب ازبر کرا دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرۂ نسب بلی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جد اعلیٰ کو ٹانگ رکھا تھا۔ ایک بلی کی قامت زیبا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے' سوا انتالیس فٹ لمبی ہے'

گونڈہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گونڈوی کے غوغائے شاعری نے گونڈہ کی بلیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لاکھ کہو' اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گونڈے کی اصل وجہ شہرت خوبصورت بلیاں تھیں۔ اصغر گونڈوی سے پہلے ایسی سیدھی' بے گانٹھ بلی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھلا چھوڑو تو بے روک' سیدھے نیچے جھن سے آ کے ٹھہرتا تھا۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا۔ بیشتر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پھاڑتے اور خود مشکل سے چرتے تھے۔ کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد و سیلاب چشیدہ Seasoned تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتی نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک "دانہ" آپ کے Approval کے لیے لے آئے ہیں۔ کبھی میری ساگوان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے' میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے' بچہ ہے۔ بہت سے بہت ۸۰ سال۔ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان اراودی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کمر استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب! ہے بلا کا سیزنڈ۔ سینکڑوں بارشوں اور سات دریاؤں کا پانی پی کے یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگر مچھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین گرہ نظر آ رہی ہے' اس پر۔ مگر مچھ جس لکڑی پر موت دے اس کو حشر تک نہ دیمک لگ سکتی ہے نہ آگ۔ اس پر خواجہ عبدالمجید جو منشیانہ ڈیسک کے لیے لکڑی خریدنے آئے تھے' پوچھ بیٹھے "کیا مگر مچھ بجلی کے کھبے کی بجائے درخت پر......" وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے۔ "جی نہیں' مگر مچھ تو سبیل اہل اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے ٹین کے گلاس سے پانی پی کے سڑک پر ٹہل ٹہل کے استنجا سکھاتے ہیں' آپ کے والد ماجد کی طرح۔ آیا خیال شریف میں؟"

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جوالا مکھی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد

اسحاق چڑے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر لکڑی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شیشم پر سچ مچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے "تخت طاؤس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی لگوائی تھی۔ شیشم کے گن گاہک اور قدر دان تو قبر میں جا سوئے۔ مگر کیا بات ہے شیشم کی! جتنا استعمال کرو اتنے ہی جوہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پر میں پیدا ہوا، اسی پر دادا میاں کی ولادت ہوئی تھی۔" اپنے حسن تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لیے باعث سعادت اور افتخار سمجھتے تھے۔"
حاجی محمد اسحاق بولے۔ "یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی۔" قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ ہے کہ آرا، رندہ، برما سب کھنڈے (کنڈ) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیز تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کر یے تک چر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تازہ کٹی ہوئی چیڑ سے بن مہکار کی ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔ لگتا ہے، اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیڑ کی کٹائی ہونے والی ہو اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا۔"
قبلہ کا موڈ بدلا تو حاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے، "یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے مگر سیزنڈ نہیں لگتی۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا "سیزنڈ..... کتنے فاقوں میں سیکھا ہے، یہ لفظ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسل میت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیا ہے اس نے۔ لاؤں؟ .... اسی پہ لٹا دوں گا۔"

○ سائی کے ساتھ عزت سادات بھی گئی

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارنیگی کے ہر اصول کی اول تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی، لیکن بزنس میں انھوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کیے تھے۔ گاہک سے

جب تک یہ نہ کہلوا لیں کہ لکڑی پسند ہے، اس کی قیمت اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں، آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جایئے، گھر کی بات ہے۔" گاہک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر ہاتھ پھیلا کر بیعانہ طلب کرتے۔ سستا سماں تھا۔ وہ دونی یا چونی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کے لیے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارتے ہوئے کہتے، چاندی دکھاؤ (یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو) وہ بیچارہ شرما حضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لیے نظر تو آتا رہے، مگر جھپٹا نہ مار سکے۔ ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے مبادا سودا پٹنے سے پہلے ہی گاہک بدک جائے۔ کچھ دیر بعد خود بخود کہتے، مبارک ہو سودا پکا ہو گیا۔ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے، عجیب گھن چکر ہو، سائی دے کر پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کے سودا پکا کیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو کہو۔ قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں گاہک دبدھا میں پڑ جائے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں کتنا نقصان ہے یا اس کے بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔ دوران حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھا پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے۔ مٹھی کبھی بند نہی کرتے تھے تا کہ بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے۔ ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک سرپھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤ لگا کر زمین پر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی تا کہ

اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے ویسی بقول ان کے "تمہیں باغ بہشت میں شاخ طوبیٰ سے بھی دستیاب نہ ہو گی۔ داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا۔" بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصول کے پکے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر "اونچی دکان" صحیح مال' غلط دام' پر سختی سے کار بند رہے۔ سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل "ہیرڈز" کا دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہوتی ہے۔ ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو بخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

○ یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کرکے کراچی آئے تھے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول' بیروزگاری' بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھنچوا لائے تھے۔ ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے۔ "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" جن دفتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں۔ ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوت استحقاق دکھاتے۔ "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو' حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ در حقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا' کبھی ڈربے' کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے' کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو۔" مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے' وہ کہاں مانتے۔ مہینوں

فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے' پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے

کا عذاب بھی سہا۔

○ اب کیا ہوئے گا

انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے "ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار" بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انھوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے' اس لیے کہ اس کے بنائے ہوئے جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا ململ کے کرتوں کی لکھنؤی کڑھائی میل میں چھپ گئی۔ چنٹیں نکلنے کے بعد آستینیں

انگلیوں سے ایک ایک بالشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں گیا' لیکن صرف بل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں۔ "اب کیا ہوئے گا؟ ہو گا کی

بجائے "ہوئے گا" ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسہ .... سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے "دیکھتے ہیں" کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

○ یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہہ میں بے نور ہو گئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دکھ بھوگتا ہے، ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے۔ اور جو دنیا کی خاطر کشت اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔ سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھا لے۔ بالفاظ دیگر، جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے، مکان اسی کا ہو گیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی حقے اور صراحی کے سبز کیریئر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علی گڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد بزنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجے کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے

کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آباد کاری بلا منت سرکار لی۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں' اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ اس سے پہلے اس پر "کسٹوڈین متروکہ املاک" کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالم جلال میں سے اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا۔ "آپ شاعر کب سے ہو گئے؟" فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا' نہ ڈگری' قرقی ہوتے دیکھی۔"

فلیٹ پر قبضہ ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا' آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہدے کی چپڑاس ان کے منہ پر اٹھا کر دے ماری۔ "افسر' محکمہ' کسٹوڈین' ایویکوی پراپرٹی" پھر ڈپٹ کر کہا۔ "بڑے میاں! فلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ۔" قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا۔ "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا۔ "بڑے میاں! سنا نہیں' الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ۔" قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا' اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے والے ہیں' اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے۔ "یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر' کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمایئے گا۔" اس نے اب تک' یعنی تادم تذلیل' رشوت ہی رشوت کھائی تھی جوتے نہیں کھائے تھے پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

○ جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی

کے جہیز کے زیور اور ویبلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آ نکلا۔ کھاتے' رجسٹریشن'

روکڑ بہی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے۔ "مشتاق صاحب! سنا آپ نے مہینوں جوتیاں چٹخاتا' دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا۔ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو۔ اب دل لگی دیکھیے' کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دندناتا آیا۔ لقہ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھا دی۔ "یہ چھوڑ کر آئے ہیں' چندرا کر پوچھنے لگا۔ "یہ کیا ہے؟" ہم نے کہا۔ "ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں۔"

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آ کر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تا کہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازے زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیا یا نئی دھوبن بھی آتی تو اسے بھی دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔"

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بار بار دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موتیا نظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کے ضعف بصارت کو قبلہ اپنے زور بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

نہ ہو اگر یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھلائی دے' لیکن

جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بالکل سیدھا سپاٹ گنوار و گھروندا معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اسے فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولایتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہوگا جس میں جڑے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جوتوں کی دھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجا تھا جس پر سر دست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذر بائیجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلافی آنکھیں مندنے لگتیں تو وقفے وقفے سے نقرئی گلاب پاشوں سے حضار محفل پر عرق گلاب مقطر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ "جتے پھول غلیچے پہ تھے وتے ہی باہر باغیچے میں تھے۔" یہاں اطالوی مخمل کے کمار چوبی زیر انداز پر گنگا جمنی منقش اگالدان رکھے رہتے تھے، جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تو بلوریں گلے میں اترتی چڑھتی صاف نظر آتی، جیسے تھرمامیٹر میں پارا۔

○ وہ ازدحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چند اندرونی کلوز اپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشم تصور کے رہین منت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آ رہے تھے ان پر Moorish Arches کی تہمت تھی۔ چراغ رکھنے کا ایک آلا (طاقچہ) ایسے آرٹسٹک زاویے سے ڈھا تھا کہ پرتگالی آرچ کے

آثار دکھائی پڑتے تھے۔ فوٹو میں اس کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی نظر آ رہی تھی جس کا شاہ جہانی ڈیزائن ان کے جد نے آب دار خانہ خاص سے بدست خود چرایا تھا۔ شاہ جہانی ہو یا نہ ہو اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا' اس لیے اس کی ایک ٹانگ تیموری تھی۔ حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں' لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رلے پھرتے تھے۔ شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اوجھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا' Roman Pillars کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کے باعث' اس کے گرنے کے لیے کوئی خالی جگہ نہ تھی۔ ایک شکستہ دیوار کے ساتھ لکڑی کی بوسیدہ نسینی (سیڑھی اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے سہارے کھڑا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی تھی تو یہاں وکٹورین اسٹائل کا Grand Staircase ہوا کرتا تھا۔ اس غیر موجود چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی نہیں لٹک سکتی تھیں' قبلہ ان آہنی کڑیوں کی نشاندہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رہتے تھے' جن کی چھپئی روشنی میں وہ گھنگھریالی خنجریاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے باختری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی رننگ کمنٹری کے ساتھ نہ دیکھے جاتے تو کسی طرح یہ قیاس و ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑکھڑائی حویلی میں اتنے فنون تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا گھمسان کا ازدحام ہو گا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرہ مل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

○ وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھوڑے پر ایک کالا مرغا گردن پھلائے اذان دے رہا تھا' وہاں ایک شکستہ چبوترے کے آثار نظر آ رہے تھے۔

اس کے پتھروں کے جوڑوں اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کر باہر نکل پڑے تھے۔ ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے کہ یہاں آب مصفا سے لبریز سنگ سرخ کا ہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا جس میں ولایتی گولڈ فش تیرتی رہتی تھیں۔ عارف میاں اس میں پایونیر اخبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔ یہ کہتے کہتے قبلہ جوش بیان میں اپنی چھڑی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پھٹی ہوئی دری پر ہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے۔ ایک جگہ فرضی لکیر قدرے ٹیڑھی کھینچی تو اسے پیر سے رگڑ کر مٹایا۔ چھڑی کی نوک سے اس بد ذات مچھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی۔ پھر ایک کونے میں اس مچھلی کی بھی نشاندہی کی جس کا جی ماندہ تھا۔ انھوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خورد تھے' لیکن ہم سمجھ گئے کہ کہ اس مچھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹی کھانے کو بھی چاہ رہا ہو گا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹیک دوپہر میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کھوٹھوں ننگے پاؤں پیر ان کی حویلی میں تپتی چھت پر آنا' اب تک (مع ڈائیلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لیے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی' جبکہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہو اور زیور حیا اتارنے کے لیے اتاؤلی بھی ہو' تب بھی یہ کرتب ممکن نہیں۔ تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دو لخت بھی نہ ہو جائے۔

○ پلکھن

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار "پلکھن" اداس کھڑی تھی۔ اس کا تخم ان کے جد اعلیٰ سمند سیاہ زانو پر سوار، کار چوبی کام کے چغے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق ان کے پردادا کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ "بے سر و سامانی کے عالم میں یہ ننگ خلائق، ننگ اسلاف، ننگ وطن .... ننگے سر، ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے .... خیبر کے سنگلاخ ننگے پہاڑوں کو پھلانگتا، وارد ہندوستان ہوا۔" جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لیے گھوڑے کی دم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائیداد، محل سرا، خدام، مال و متاع سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرۂ نسب اور پلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جو انہی کی طرح نجیب الطرفین اور وطن مالوف سے بیزار تھا، تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

○ شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے سے زمین جائیداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرۂ روزگار تھا اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔
قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کر کھنچوایا تھا جہاں ان کی نال گڑی تھی۔ فرماتے تھے، اگر کسی تخم ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے۔ جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی

ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنی نال' پرکھوں اور پلکھن کا ذکر اتنے فخر' غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں' جیسے گھٹنوں میں پانی اتر آتا ہے۔

○ امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے۔ شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی بزرگ امپورٹڈ یعنی ماوراء النہر اور خیبر کے اس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں' کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی بگھارنے کے لیے اپنا (فرضی) استاد ملا عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عسرت سے تنگ آ کر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دست افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیوہ بیان کے بقول ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفراللہ' استغفراللہ کہتے۔ تازہ ولایت جس سے ملے' اپنے حسن اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جاں' پھر جان جاں' پھر جان جاناں ہو گئے
پھر یہی پیارے لوگ بتدریج ....
پہلے خاں' پھر خان خاں' پھر خان خاناں ہو گئے

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ باقی تھا۔ فرماتے تھے' جس سال میرے یہ اورنگ زیبی پھوڑا نکلا' اسی سال بلکہ اسی ہفتے ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئی تو شاہجہانی

جس بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہر عشق سے مار ڈالا مگر خود اسی گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے کہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دمے کا دورہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی صاحب کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعہ میں کہا ہے کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے' مگر آدھا سانس کسی طور نہیں سما رہا۔ اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سنگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض' قبلہ ناک تک اپنی نہیں تھی' یونانی بتاتے تھے۔

○ "مردہ" از غیب بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا کہ وہ جانگسل تھا۔ دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں تھا جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گھل رہی تھی۔ اس غریب نے بڑی منتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکئے کے نیچے تعویذ رکھے۔ چھپ چھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے۔

مردہ از غیب بروں آید و کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہل قبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اس زمانے کے اہل القبور' صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں' کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت

ہے تو غنیمت جانئے ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے۔ جس کا اس دھوم سے عرس شریف منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے

ہو کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گاگر شریف جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل شریف دیا جائے گا۔ بعد نماز مغرب لنگر شریف تقسیم ہو گا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں کے ضمن میں "شریف" پر تاکیداً اتنا زور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم ضعیف الاعتقاد ہیں نہ وہابی' لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پر ہوا ہے' بالاعلان یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے' سوائے صاحب مزار کے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ بیوی اولاد نرینہ کی منت مانگنے چوری چھپے نامحرموں کے مزاروں پر جانے لگی ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے ربڑی' موتی چور کے لڈو اور کچوری لا کر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹا اوڑھ لیتیں اور ان کے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیازہ' ڈیوڑھی شکر والا زردہ اور بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کھلا کر انہیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔

مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی مگر اس شرط پر کہ مزار کا مکین "ذات کا کمبوہ نہ ہو' کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے' خواہ مردہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں۔" ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور ننھیال کی طرف سے کمبوہ تھے۔ اکثر فرماتے "مرگ کمبوہ جشنے دارد"

○ کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آ گیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انہیں اس حد تک صبر آ گیا کہ اکثر فرماتے' خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا' اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا اور اگر نہ پڑتا تو ناخلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی کتنی بھی چہیتی ہو' ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی' ضرورت رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق' قبول صورت' سلیقہ شعار' خوش اطوار' امور خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیغام دے۔ ہمیں آتش نمرود میں کودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں لیکن وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آتش نمرود میں بے خطر کودنے سے کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرۂ نسب میں کود پڑنا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکے ہیں' قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپھا' چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے۔ دکان اور مکان' دونوں اعتبار سے' پڑوسی بھی تھے۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے' لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہو سکتا ہے لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہو گی۔ بشارت نے ریل کی پٹڑی سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کروانے کی دھمکی دی۔ رسیوں سے بندھوانے کی شرط خود اس لیے لگا دی کہ عین اس وقت پر اٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں تمہیں گھنٹی ڈالو۔

قبلہ "مدمغ" بد لحاظ' منہ پھٹ مشہور ہی نہیں' تھے بھی وہ دل سے .... بلکہ بے دلی سے بھی۔ کسی کی عزت نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے۔ مثلاً کسی کی عمر ان سے ایک مہینہ بھی کم ہو تو اسے لونڈا کہتے اور

اگر ایک سال زیادہ ہو تو بڑھنو!

○ ب و ر ہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان' بقول ان کے ففٹی ففٹی تھا۔ ففٹی ففٹی اتنے زور' فخر اور وثوق سے کہتے اپنی کانٹا تول نصفا نصف نالائقی سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے۔ روحوں کو بلاتے اور ان سے ایسے سوال کرتے کہ زندوں کو حیا آتی۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلینک پر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تہذیب و تعزیرات ہند خالی چھوڑ دیئے تھے۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا "ٹھیکا" لگاتے۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی گج گامنی نثر کی چھاپ' ایک انہی پر موقوف نہیں' اچھے اچھوں کی طرز تحریر پر تھی۔ بعضوں پر ماتھے کے جھومر کی مانند۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گدوا لیتے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔ اردو نثر اس زمانے میں فیل پا میں مبتلا تھی۔ اس میں کچھ افاقہ ہوا تو معجون فلک سیر کھا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اڑن غالیچے پر سوار ہو گئی۔
بشارت کے ایک افسانے کا کلائمکس کچھ اس طرح تھا۔
"انجم آراء کی حسن آفرینیوں' سحر انگیزیوں اور حشر سامانیوں سے مشام جان معطر تھی۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرط حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی دزدیدہ دزدیدہ آنکھوں پر رکھا۔ سلیم نے انجم آراء کے دست حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیرا تراش کلائی اور ساق بلوریں کو دیکھا اور گلنار سے لبوں پر چار نقطے ثبت کر دیئے۔"

اس زمانے میں لفظ "بوسہ" فحش سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے۔ بشارت گن کر اتنے ہی نکتے لگاتے جن کی اجازت اس وقت کے حالات' حیا یا ہیروئین نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں جہاں جہاں لفظ بوسہ آیا وہاں وہاں مولوی عبدالحق نے بر بنائے تہذیب اس کے ہجے یعنی ب'و'س'ہ چھاپ کر الٹا اس کی لذت و طوالت میں اضافہ فرما دیا۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنے حبیب لبیب کی طرز نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں' ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا' کبھی عبا و عمامہ' کبھی ڈنر جیکٹ یا فولس کیپ' کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے تھے۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے بندر ناچنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیدائش اس طرح بتاتے ہیں۔

"یہ غریب الدیار عہد' ناآشنائے عصر' بیگانہ خویش' نمک پروردہ ریش' خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد' مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔"

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی خجالت' طوالت و اذیت تو آج کل سیزرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔

○ کوہ آتش فشاں میں چھلانگ

بالاخر ایک سہانی صبح بشارت نے بقلم خود رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوا دیا۔ حالانکہ مکتوب الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۳ صفحات اور کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلیب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے برادرانہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس رقعے کے لیے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی ہوتا۔ لہٰذا صرف القاب و آداب زعفران

سے اور بقیہ مضمون سرخ روشنائی سے زیڈ کے موٹے نب سے لکھا۔ جن حصوں پر بطور خاص توجہ دلانی مقصود تھی انہیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا۔ مدعا اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدویانہ اور مضمون بے حد خوشامدانہ تھا۔ قبلہ کے حسن اخلاق' شفقت' خوش خوئی' خوش معاملگی' صلہ رحمی' نرم گفتاری' مردانہ وجاہت .... مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کی نام بنام ڈٹ کر برائی کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کرکے کھرل کرنا انہی کا کام تھا۔ بشارت نے جی کڑا کرکے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں' لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے۔ مضمون بے ربط و ژولیدہ سہی لیکن قبلہ اپنے حسن سیرت اور دشمنوں کی حرامزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجیہہ بھی نہیں کہا تھا۔ دو دفعہ پڑھ کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحبزادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کئے ہیں۔

قبلہ دیر تک اپنے مبینہ اوصاف حمیدہ پر دل ہی دل میں اترایا کئے۔ گلیشئر تھا کہ پگھلا جا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے منشی جی سے گویا ہوئے۔ بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کر یے تک سارے حروف تہجی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ جیسے عید گاہ میں نمازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں۔

بشارت کی جرات رندانہ کی کہانی جس نے سنی ششدر رہ گیا۔ خیال تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ قبلہ نے اگر ازراہ ترحم سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک کی ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی میں قبول کر لیا۔

○ راون کیوں مارا گیا؟

قبلہ کی دکانداری اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کی ایک مثال ہو تو بیان کریں۔ کوئی گاہک اشارتاً یا کنایتاً بھی ان کی کسی بات پر بھاؤ پر شک کرے تو پھر اس کی عزت ہی نہیں' ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ عجلت میں تھے۔ لکڑی کی قیمت چھوٹتے ہی دس روپے میں بتا دی۔ دیہاتی گاہکنے پونے دس روپے لگائے اور یہ گالی یدتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ جٹ گنوار کو اتنی جرات کیسے ہوئی دکان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی رہتی تھی جس کے بانوں کو چرا چرا کر آرا کھینچنے والے مزدور چلم میں بھر کے سلفے کے دم لگاتے تھے۔ قبلہ جب باقاعدہ مسلح ہو کر حملہ کرنا چاہتے تو اس چارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کی پٹی نکال کر اپنے دشمن یعنی گاہک پر جھپٹتے۔ اکثر سیروے کو پچکارتے ہوئے فرماتے۔ "عجب سخت جان ہے۔ آج تک اس کا فریکچر نہیں ہوا۔ لٹھ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے۔ اور لاٹھی چلانا' قصائی' کنجڑوں' غنڈوں اور پولیس کا کام ہے۔" استعمال کے بعد سیروے کی فرسٹ ایڈ کرکے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر واپس جھلنگے میں لگا دیتے۔ اس طریقہ واردات میں غالباً یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ چارپائی تک جانے اور سیروا نکالنے کے وقفے میں اگر غصے کو ٹھنڈا ہونا ہے تو ہو جائے۔ اور اگر ان کے معتوب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بخل سے کام نہ لے۔ ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ لڑائی کے جو ۳۷ پینترے داناؤں نے گنوائے ہیں۔ ان میں جو پینترا سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو۔ اس کی تصدیق ہندو دیو مالا سے بھی ہوتی ہے۔ راون کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے۔ پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لیے صرف دو ٹانگیں تھیں۔ حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خوخیاتے تا کہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو بچا لے۔ فرماتے تھے' آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکائی کرنے سے پہلے میں نے اسے گالی دے کر خبردار نہ کیا ہو۔ کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں!

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

انسانی کردار میں مچھر کی صفات پیدا کرکے اتنا فخر کرتے ہم نے انھی کو دیکھا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، بی ٹی نے ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے مجموعہ بعنوان "خطبات چاکسو" کی آوٹ لائن بنائی۔ "مشرقی شعر و روایت میں پشہ کا مقام، تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے" اور "موازنہ پشہ و شاہین" ہمارے قارئین ماشاء اللہ عاقل ہیں۔ اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

○ ہوں لائق تعزیر پہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکاندار کے۔ وہ قنوج کا رہنے والا، نہایت خود سر، ہتھ چھٹ، بد معاملہ اور بد زبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہو گا۔ یعنی جوان اور سرکش۔ چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا، پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ "مہاراج! مہاراج" پکارتے ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کر چھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پہلوان سیٹھ نے ان کی وہ گالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔
پھر کیا تھا۔ قبلہ نے اپنے اسلحہ خانہ خاص یعنی چارپائی سے پٹی نکالی اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ گاہک نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کارروائی سے ریٹائر ہو گیا۔ دریدہ دہن

پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ قبلہ اس کے پیچھے سرپٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پٹڑی میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا۔ قبلہ نے جا لیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پٹڑی پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گرد خون کی تلیا سی بن گئی۔

پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کی ملٹی پل فریکچر میں گنگرین ہو گیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیسہ کھلایا۔ اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر قبلہ کا اقدام قتل میں چالان پیش کر دیا۔ تعزیرات ہند کی اور بہت سی دفعات بھی لگا دیں۔ لمبی چوڑی فرد جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیرات ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گرفتار کرکے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا۔ "اب کیا ہوئے گا؟" کندھے اچکاتے ہوئے بولے۔ "دیکھیں گے" عدالت مجسٹریٹ میں بیچ بچاؤ کرنے والے گاہک کا دانت اور آلہ قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹی کے بطور Exhibits پیش ہوئے۔ مقدمہ سیشن سپرد ہو گیا۔ قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار مہینوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔

ان کی طرف سے یعنی بحیثیت وکیل صفائی، کانپور کے ایک لائق بیرسٹر مصطفیٰ رضا قزلباش نے پیروی کی۔ مگر وکیل اور موکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بضد تھے کہ حلف اٹھا کر یہ بیان دوں گا کہ مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک اوباش دوست سے ملتی ہے۔ بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پٹڑی پر گرنے سے آئی ہے نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے۔ ادھر قبلہ کمرۂ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح ٹہل ٹہل اور کٹہرے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہوں۔ دکانداری میرے لیے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی۔ بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ

آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پر وار کرنا ہماری شان سپہ گری اور شیوۂ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سر پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے سزا دینی ہی ضروری ہے تو ٹانگ توڑنے کی نہیں' غلط نشانے کی دیجئے۔ ہوں لائق تعزیر پہ الزام غلط ہے۔

○ ایام اسیری اور جون کا "بلڈ ٹیسٹ"

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا مچتا۔ اعزہ اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آ گئی۔ پولیس انہیں ہتھکڑی پہنائے سارے شہر کا چکر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں۔ "بھیا! کیا سچ مچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟" عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیہ اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن جھن کرتی۔ رمضان آئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجئے۔ اپنے کان ہی پور کے مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔ "لاحول ولا قوہ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہو گا غم روزگار سہہ نہ سکا۔"

بیوی نے کئی مرتبہ پچھوایا۔ "اب کیا ہوئے گا؟"

ہر بار ایک ایک ہی جواب ملا۔ "دیکھ لیں گے۔"

طیش کے عالم میں جو بات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے اس پر انہیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اپنے کسی کرتوت یعنی اصل کردار پر پشیمان

یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے اشتہار میں لکھا گیا تھا کہ اس کے ملنے سے جوئیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جا سکتا ہے۔ جوں اور لیکھ مارنے کی مروجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جوں کے پیٹ سے کالا یا گہرا عنابی خون نکلے تو فوراً ہماری دوا "اکسیر جالینوس" مصفی خون پی کر اپنا خون صاف کیجیے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کا کورس اس وقت تک جاری رکھیے جب تک کہ جوں کے پیٹ سے صاف شدہ سرخ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگلے کے اس طرف سے اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ برخوردار! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ دنیا' اس جیل سمیت' سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لیے ردی کے اخباروں کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر الن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا۔ الن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوؤں کی ایسی ٹھکائی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پرزہ بھتیجے کو تھما دیا' جس کے حاشیہ پر ان چھ گواہان استغاثہ کے نام درج تھے' جن کو پٹوانے کا انھوں نے جیل میں اس وقت منصوبہ بنایا تھا۔ جب ایسی ہی حرکت پر انہیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔

ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کو آیا اور ان سے کہا کہ جیلر تک باآسانی سفارش پہنچائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے شوق کی مثنوی' سگریٹ یا مہوے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے۔ عید نزدیک آ رہی ہے۔

رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں۔

قبلہ نے جیل کے کھدر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹمل پکڑتے ہوئے کہا۔ مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فوٹو گرافر سے حویلی کا فوٹو کھنچوا کے لے آنا۔

کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمہاری چچی کے کمرے کے چق ہے' اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔

سنتری نے زمین پر زور سے بوٹ کی تھاپ لگاتے اور تھری ناٹ تھری رائفل کا کندہ بجاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ عید کا خیال کرکے بھتیجے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ قبلہ نے اس کا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے منہ تک لانے کے بعد کہا' ہاں! ہو سکے تو جلد ایک تیز چاقو' کم از کم چھ انچ کے پھل والا' ڈبل روٹی یا عید کی سویوں میں چھپا کر بھجوا دو۔ دوم' بمبئی میں Pentangular شروع ہونے والا ہے۔ کسی ترکیب سے مجھے روزانہ اسکور معلوم ہو جائے تو واللہ! ہر روز "روز عید" ہو' ہر شب "شب برات" خصوصاً وزیراعلیٰ کا اسکور دن کے دن معلوم ہو جائے تو کیا کہنا۔

سزا ہو گئی۔ ڈیڑھ سال قید بامشقت۔ فیصلہ سنا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں۔ "تو دیکھ رہا ہے' یہ کیا ہو رہا ہے؟ ..... How's That?" پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جد اعلیٰ کی روح پر فتوح کتنی مسرور ہو گی۔ کتنی خوش نصیب بی بی ہو تم کہ تمہارا دولہا (جی ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا) ایک حرام زادے کی ٹھکائی کرکے مردوں کا زیور پہنے جیل جا رہا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ لگوا کر گھر نہیں آ رہا۔ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا' یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعہ کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔

بیوی نے پچھوایا اب کیا ہوئے گا؟
جواب ملا' دیکھا جائے گا

○ ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد چپ چپاتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے ہوں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے' پھر بھی بندر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح! Aauuaauuuu چنگھاڑتے جیل سے نکلے۔ سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائنتی کی خاک سر پر ڈالی۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیئے۔ دوسرے دن دکان کھولی۔ کیبن کے باہر ایک بلی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھئی سے بنوا کر لٹکا دی۔ صبح اور شام اس کو رسی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن نادہندوں نے دو سال سے رقم دبا رکھی تھی انہیں یاد دہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ اور اپنے دستخطوں کے بعد بریکٹ میں (سزا یافتہ) لکھا۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے "ننگ اسلاف" لکھا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے۔ اتفاق تو درکنار' مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ ننگ اسلاف کے بجائے "سزا یافتہ" اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کاٹ کر واپس آ گئے۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس اثنا میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب ان کی رائے میں قطعیت کے علاوہ فقطعیت بھی پیدا ہو گئی۔ ان کا فرمایا

ہوا مستند تو پہلے ہی تھا' اب مختتم بھی ہو گیا۔ سیاہ مخمل کی رام پوری ٹوپی اور زیادہ ترچھی ہو گئی۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اب کبھی بیوی گھبرا کے "اب کیا ہوئے گا؟" کہیں تو وہ "دیکھتے ہیں" کے بجائے "دیکھ لیں گے" اور "دیکھتی جاؤ" کہنے لگے۔ رہائی کے دن نزدیک آئے تو داڑھی کے علاقے کے بال بھی گچھے دار مونچھوں میں شامل کر لیے جو اب اتنی گھنی ہو گئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر انہیں اٹھاتے' تب کہیں دوسرے ہاتھ سے منہ میں لقمہ رکھ پاتے تھے۔ جیل ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ فرماتے تھے "یہیں تیسرے بیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے۔ فصاحت یار خان۔ غبن اور دھوکہ دہی میں تین سال کی کاٹ رہا ہے' با مشقت۔ پہلے شعلہ' اب حزیں تخلص کرتا ہے۔ بلا کا بسیار گو۔ چکی پیستے میں اپنی ہی تازہ غزل گاتا رہتا ہے۔ موٹا پیتا ہے اور پٹتا ہے۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں۔ تس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا۔ حالاں کہ مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا کھائی۔ خود کو روہیلہ بتاتا ہے۔ ہو گا۔ لگتا نہیں۔ قیدیوں سے بھی منہ چھپائے پھرتا ہے۔ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں۔ جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا' زنداں کہتا ہے۔ اور خود کو قیدی کے بجائے' اسیر۔ ارے صاحب! غنیمت ہے جیلر کو عزیز مصر نہیں کہتا۔ اسے تو چکی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی' مگر میں تو جانوں پاٹ کی عربی معلوم نہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ استفراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے' بدبو جاتی رہتی ہے۔ ٹھیک ہی سمجھتا ہے۔ کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال ہیضے میں ہوا تھا۔ ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کاٹ کر تھوڑا ہی آیا ہوں۔ شیر کو پنجرے میں قید کر دو' تب بھی شیر ہی رہتا ہے۔ گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو' اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھٹنا (گھٹنوں تک نیکر) پہنتے ہی طبیعت میں سوز و گداز

پیدا ہو جائے۔" بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پھٹا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنت یوسفی سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو ٹیڑھ تھی وہ کچھ اور بڑھ گئی۔ کوے پر کتنے ہی صدمے گزر جائیں' کتنا ہی بوڑھا ہو جائے' اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں۔ اکل کھرے کھرے' کھردرے کھرے یا کھوٹے' وہ جیسے کچھ بھی تھے ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔

تن اجرا من گاوَلا بگلا جیسے بھیس
ایسے سے کاگا ' بھلے باہر بھیتر ایک

فرماتے تھے' الحمدللہ! میں منافق' ریا کار نہیں۔ میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔ دکان دو سال سے بند پڑی تھی۔ چھوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے پوچھا۔ "اب کیا ہوئے گا؟"
"بیوی! ذرا تم دیکھتی جاوَ۔"

○ لبِ معشوق

اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انہیں بھی حیرت ہوئی۔ دکان کے باہر اسی شکار گاہ یعنی کیبن میں اسی ٹھسے سے گاوَ تکئے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ مگر زاویہ پسر گیا تھا۔ پیروں کا رخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا۔ جیل میں سکونت پذیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے ملتجیانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے۔ اب صرف انگشت شہادت کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے۔ انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں۔ حقے کی نے میں اب ایک فٹ کا اضافہ کر لیا۔ حقہ اب پیتے کم' گڑگڑاتے

زیادہ تھے۔ بدبودار دھوئیں کا چھلا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں نتھ کی طرح لٹک جاتا۔ اکثر فرماتے "واجد علی شاہ' جان عالم پیانے' جو شخص کبھی حقے کے پاس سے بھی گزرا ہے' وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جان عالم پیا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہو گا۔ چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقہ اپنے ہمراہ مٹیا برج لے گئے۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے۔ اس لیے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گڑگڑایا نہیں جا سکتا۔

○ بلی پہ لٹکا دوں گا

منشی دیا نرائن نگم کے رسالے "زمانہ" کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا۔

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

ہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانبداری کی بو آتی ہے۔ کتے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا۔ "آواز گدا کم نہ کند رزق سگاں را"
کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے کہ سالے کو بلی پہ لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے' قبلہ جس گاہک کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیں' اسے کوئی دوسرا نہیں بلاتا تھا۔ اگر وہ از خود دوسری دکان میں چلا بھی جائے تو دکاندار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر

منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا' اس کا مالک اور منیم اسے گھسیٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں

اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روہانسا ہو کر کہا کہ میں تو مول گنج پتنگوں کے پیچ دیکھنے جا رہا تھا۔

○ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکایک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ وہ کٹر مسلم لیگی تھے۔ اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنتے دیکھا۔ اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی۔ گاہکوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ لکڑ منڈی کے چوہے شیر ہو گئے۔ عزیز و اقارب جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے' ایک ایک کرکے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوچ کے کراچی سدھارے تو انہوں نے بھی اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ "بے نامی" سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی لنگڑے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا' مگر "اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے" والی صورت حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں پیڑھیوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پرکھوں کی جنم بھوم چھوڑ کر ان کے خوابوں کی سرزمین کا رخ کیا۔
ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے' قبلہ ہجرت کرکے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی' بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تو لی مارکیٹ میں ہرچند رائے روڈ پر لشتم پشتم دکان کھول لی' مگر بات

نہیں بنی۔ گجراتی میں مثل ہے کہ پرانے مٹکے پر نیا منہ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز زمین میں آ گئے' مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈتی رہیں۔ پلکھن تو درکنار' انہیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جسے نیم بتاتے تھے وہ دراصل بکائن تھی جس کی نبولی کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم' پیچش اور بواسیر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

کہاں کانپور کے دیہاتی گاہک' کہاں کراچی کے نخریل ساگوان خریدنے والے' درحقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب و جوار میں' یعنی اپنے سایہ زحمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ وجہ و بے خطر گالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے "یہاں تو بڑھئی آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ دن ہوئے۔ ایک دریدہ دہن بڑھئی آیا۔ اقبال مسیح نام تھا۔ میں نے کہا' اے پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا' حضرت عیسیٰ بھی تو ترکھان تھے۔ میں نے کہا' کیا کفر بکتا ہے؟ ابھی بلی پہ لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا' اوہ لوک وی ایہی کہندے ساں" (وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے)

○ میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا۔

"حضرت' یہ مچھر ہیں یا مگر مچھ۔ کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف

قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولادا مرتا ہے۔ نمرود مردود کی موت ناک میں مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرۂ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اس مچھر سے جا ملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایک صاحب کو پٹے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتے کو بلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں چپراسی کو پٹے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھڈا اور لفڑا ہوتا رہتا ہے۔ ٹوکو تو کہتے ہیں' اردو میں اس صورت حال کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے' اردو میں یہ صورت حال بھی تو نہیں ہے۔ بمبئی والے لفظ اور صورت حال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لیے بات نہ کی کہ "زبان غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے" میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھاٹا باندھے پھرتے' یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دھر لیے جاتے۔ اماں' ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا۔ یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے "صاحب" لگا دیں تو مراد نواب صاحب لسبیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری گانٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دو دن لاہور رکا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کوئلوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے' وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے۔ اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے لگے ہیں۔ میاں' ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکوکار اور بدکار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

"میں نے لالو کھیت' بہار کالونی' چاکی واڑہ اور گولیمار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں) ضرور رہتے ہوں گے۔ لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے۔ کانپور میں ہم جیسے شرفاء کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی بیل

ضرور چڑھی ہوتی تھی۔ حضور والا' یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے۔ حد ہو گئی' کراچی میں لکھ پتی' کروڑ پتی' سیٹھ لکڑی اس طرح نپواتا ہے گویا کم خواب کا پارچہ

خرید رہا ہے۔ لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور برادہ خریدنے والے پچاس۔ میں نے برسوں اپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن برادے کی انگیٹھی پر جو کھانا پکے گا وہ صرف دوزخی مردوں کے چالیسویں کے لیے مناسب ہے۔

"بھر پائے ایسی بزنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے' مگر سبھی کچھ تو نہیں۔ زر کو حاجت روا کرنے والا' قاضی الحاجات کہا گیا ہے۔ تسلیم' مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہو گی۔ میں نے تو زندگی میں ایسی کافی کھتری لکڑی نہیں بیچی۔ نہ فروختنی' نہ سوختنی۔ بڑھئی کی یہ مجال کہ چھاتی پہ چڑھ کے کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیتے رہو۔ ہائے! نہ ہوا کانپور' بسولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا اپنی جروا کو دین مہر میں دے دینا۔ واللہ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں یہاں کے بازار حسن نیپیئر روڈ اور جاپانی روڈ پر شب زادیاں اپنے اپنے درشن دریچوں میں لال بتیاں جلتے ہی خنجراب چھاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلقات ہی کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اوچھے کے گھر تیتر' باہر باندھوں کہ بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار بے سروکار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مجرے کے لیے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے' رنڈی کو پرمٹ' راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے یہیں دیکھا۔ نقد عیش عندالطلب نہ ملا تو کس کام کا۔ درشنی منڈیوں میں درشنی ہنڈیوں کا کیا کام۔"

مرزا عبدالودود بیگ اس صورت حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC اس لیے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کر لے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جا رہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصہ لینے نہیں جا رہی۔

ایک دن قبلہ فرمانے لگے۔ "ابھی کچھ دن ہوئے' کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں' اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے' ایک زمانہ تھا کہ شرفاء اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لیے چوک کی طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجتے تھے۔"

اس باب میں بھی مرزا سوء ظن سے کام لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لیے بھیجتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچے رہیں۔

○ دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ جھنجلا کر بار بار کہتے۔ "اماں' یہ شہر ہے یا جہنم؟" مرزا کسی دانا کے قول میں تصرف بے جا کر کے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دارالمحن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدا نخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہو گا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ "تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔"

ارشاد فرمایا۔ "سنو' میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کے کام بھی کئے ہیں مگر دوزخ کی ائیر کنڈیشنگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا۔"

بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ' تلک اور چھب چھونانے سے پہلے وہ جس آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اترایا کئے' اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتداد زمانہ سے Distorting Mirror (مسخائینہ) بن چکا تھا جس میں ہر شکل اپنا ہی منہ چڑاتی نظر آتی تھی۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا۔

نہ پوچھ حال مرا' چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کے لیے کہا' آپ کو چوب خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلاف معمول مسکرائے۔ جب سے ڈینچرز ٹوٹے' منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے "ہاں میاں! آپ جوان آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ حال ہوا کہ

"منفعل" ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں "ابتذال" کہاں

پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا۔ "برخوردار! میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔"

○ میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

یوں وہ حتی الامکان اپنے غصے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے' میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے روٹھے۔ اب وہ آپ ہی آپ کڑھتے' اندر ہی اندر کھولتے' سلگتے رہتے۔

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا
میں ہی اگنی میں ہی ایندھن

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصہ جتنا کم ہو گا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ بزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔ واماندگی زیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں۔ گویا البم کھل گیا۔ دھندلاتے سیپیا رنگ کی تصویریں چشم تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹتا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی۔ دھوپ میں ابرق کے ذروں سے جلتی کچی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نر مہکار۔ بھیڑ کے نوزائیدہ بچے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان۔ چلمنوں کے پیچھے ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے۔ ارہر کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ۔ خشک سالی میں ساون کے تھوتھے بادلوں کو رہ رہ کر تکتی نر آس آنکھیں۔ جاڑے کی اجاڑ راتوں میں ٹھٹھرتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں۔ چراغ جلے باڑے میں لوٹتی گایوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں۔ کالی بھنور رات میں چوپال کی جلتی بجھتی گشتی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش۔ موتیا کے گجروں کی لپٹ کے ساتھ کنوارے پنڈے کی بگولا مہکار۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تازہ قبر پر جلتی اگر بتی کا بل کھاتا دھواں۔ دہکتی بالو میں تڑختے چنوں کی سوندھی لپٹ میں پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ میونسپلٹی کی مٹی کے تیل کی لالٹین کا بھبھکا۔ یہ تھی ان کے گاؤں کی ست سگند۔ یہ ان کے اپنے نافہ ماضی کی مہکار تھی جو یادوں کے دشت میں دوانی پھرتی تھی۔

○ اولتی کی ٹپا ٹپ

ستر سالہ بچے کے ذہن میں تصویریں گڈ مڈ ہونے لگتیں۔ خوشبوئیں' نرماہٹیں اور آوازیں بھی تصویر بن بن کر ابھرتیں۔ اسے اپنے گاؤں میں مینہ برسنے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی۔ ٹین کی چھت پر تڑ تڑ بجتے ہوئے تاشے۔ سوکھے پتوں پر کراری بوندوں کا شور۔ پکے فرش پر جہاں انگل بھر پانی کھڑا ہو جاتا' وہاں موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اچھل پڑتا۔ تپتی کھپریلوں پر اڑتی بدلی کے جھالے کی سنسناہٹ۔ گرمی دانوں سے اپڑے بالک بدن پر برکھا کی پہلی پھوار' جیسے کسی نے منتھول میں نہلا دیا ہو۔ جوان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کا ننگے سر آنگن میں آ آ کر آسمان کی طرف دیکھنا۔ پھبک اٹھنے کے لیے تیار مٹی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادل کی ہراول گرم لپٹ۔ ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر بجتی چوڑیاں اور بے تال قہقہے۔ سوکھے تالاب کے پیندے کی چکنی مٹی میں پڑی ہوئی دراڑوں کے لوازماتی جال میں ترسا ترسا کر برسنے والی بارش کے سرسراتے ریلے۔ تھونی سے لٹکی ہوئی لالٹین کے سامنے' تا حد روشنی' موتیوں کی رم جھم جھالر' ہمک ہمک کر پرائے آنگن میں گرتے پرنالے۔ آموں کے پتوں پر مجیرے بجاتی نرسل بوچھار۔ اور جھولوں پر پینگیں لیتی دوشیزائیں۔

اور پھر رات کے سناٹے میں' پانی تھمنے کے بعد' سوتے جاگتے میں' اولتی کی ٹپا ٹپ۔

اولتی کی ٹپا ٹپ تک پہنچتے پہنچتے قبلہ کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں۔ بارش تو ہم انہیں اپنے لاہور میں نتھیا گلی کی ایسی دکھا سکتے تھے کہ عمر رفتہ کی ساری ٹپا ٹپ بھول جاتے۔ پر اولتی کہاں سے لاتے؟ اسی طرح آم تو ہم ملتان کا ایک سے ایک پیش کر سکتے تھے۔ دسہری' لنگڑا' ثمر بہشت' انور رٹول۔ لیکن ہمارے پنجاب میں تو ایسے درخت ناپید ہیں جن میں آموں کے بجائے دوشیزائیں لٹکی ہوئی ہوں۔

چنانچہ ایسے نازک موقعوں پر ہم خاموش' ہمہ تن گوش بلکہ خرگوش بنے اولتی کی ٹپاٹپ سنتے رہتے۔

○ قبلہ کا ریڈیو اونچا سنتا تھا

دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں۔ ہمارا مطلب ہے' دریا کا نقصان نہیں۔ لیکن قبلہ تو سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیاگرا پر تیر کر چڑھنا

چاہتے تھے۔ یا یوں کہئے کہ تمام عمر نیچے اترنے والے ایس کے لیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور ایس کے لیٹر بنانے والے کو گالیاں دیتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے۔ "مشتاق میاں یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم ناشناس شہر ہے۔ نہ خریداری کی تمیز' نہ خوردی کے آداب۔ نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ ملاحظہ۔ میں جس زمانے میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا۔ ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگانی پڑتی تھی۔ بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی۔ اس کا رکھنا اور چلانا ایک درد سر تھا۔ بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنے کارخانے لے جاتے اور چارج ہونے کے لیے آراء مشین میں لگا دیتے۔ سات آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہو جاتی کہ بس ایک آدھ گھنٹے بی بی سی سن لیتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سے آرا مشین کی آوازیں آنے لگتیں اور میں اٹھ کر چلا آتا۔ گھر کے پچھواڑے ایک پچیس فٹ اونچی نہایت قیمتی' بے گانٹھ بلی گاڑ کر ایریل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ریڈیو اونچا سنتا تھا۔ آئے دن پتنگ اڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے پیچ لڑاتے۔ مطلب یہ کہ اس میں پتنگ الجھا کر زور آزمائی کرتے۔ ڈور ٹوٹ جاتی' ایریل خراب ہو جاتا۔ ارے صاحب' ایریل کیا تھا' پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا۔ اس پر یہ کٹی پتنگیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑپھڑاتی رہتیں جیسے سڑک کے کنارے کسی نوفوتیدہ پیر کے مزار پر جھنڈیاں۔ پچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا۔ نہ پوچھئے کیسا عذاب تھا۔ بس یوں سمجھئے سولی پہ لٹک کے بی بی سی سنتا تھا۔ بہرحال جب برنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے لگا تو سوچا' وہاں تو بجلی ہے۔ چلو ریڈیو بیچتے چلیں۔ بشارت میاں بھی عاجز آ گئے

تھے۔ کہتے تھے' اس سے تو پتنگوں کی پھڑپھڑاہٹ براڈ کاسٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دور کے پڑوسی سے ۲۵۰ روپے میں سودا پکا ہو گیا۔ علی الصبح وہ نقد رقم لے آیا اور میں

نے ریڈیو اس کے حوالے کر دیا۔ رات کو گیارہ بجے پھاٹک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص اور اس کے بیل جیسی گردن والے دو بیٹے کدال پھاوڑا لیے مزے سے ایریل کی بلی اکھاڑ رہے ہیں۔ میں نے ڈپٹ کر پوچھا' یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھیے! کہتے ہیں' بڑے میاں! بلی اکھاڑ رہے ہیں' ہماری ہے۔

"ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے' بلی سے کیا تعلق"

"تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بلی کے بغیر بجا کے دکھا دو۔ یہ تو اس کی Accessory ہے۔

"نہ ہوا کانپور' سالے کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔ اور ان حرامی پلوں کی بیل جیسی گردن ایک ہی وار میں بھٹا سی اڑا دیتا۔ میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ' بے ایمان آدمی نہیں دیکھا۔ اس اثناء میں وہ نابکار بلی اکھاڑ کے زمین پر لٹال چکا تھا۔ ایک دفعہ جی میں تو آئی کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بلی کے برابر لمبا لٹال دوں۔ پھر خیال آیا کہ بندوق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے۔ اور کمینے کے منہ کیا لگنا۔ اس کی بے قصور بیوی رانڈ ہو جائے گی۔ وہ زیادہ قانون چھانٹنے لگا تو میں نے کہا' جا جا! تو کیا سمجھتا ہے؟ بلی کی حقیقت کیا ہے۔ یہ دیکھ یہ چھوڑ کے آئے ہیں۔"

قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بلی اٹھا کر لے گئے۔

○ معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا تھا جس کا کسی نے ان کا اشارتاً بھی ذکر کرتے نہیں سنا۔ ہم اس کی طرف ابتدائی حصے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی شادی بڑے چاؤ چونچلے

سے ہوئی تھی۔ بیوی بہت خوبصورت' نیک طینت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں۔ قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے۔ روزمرہ کی ملاقاتیں' شادی غمی میں شرکت' سبھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے۔ گھر کا سارا کام نوکر اور مامائیں تو نہیں کر سکتیں۔ قبلہ نے جس محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ ریکھ کی' اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹہ بے چنا ہو۔ یا جمعہ کو کاسنی رنگ کا نہ ہو۔ سال گزرتے چلے گئے۔ وقت نے سر پر کاسنی دوپٹے کے نیچے روئی کے گالے جما دیے۔ مگر ان کی توجہ اور پیار میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایثار و رفاقت کا یہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلوار ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سبھاو کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں۔ انہوں نے اس معذور بی بی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلاہٹ اور غیظ و غضب کی ابتدا اسی سانحہ معذوری سے ہوئی۔ وہ بی بی تو مصلے پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا ہی میں جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انہوں نے چالیس برس تک کی وہی ان کی عبادت و ریاضت' وہی ان کا درد وظیفہ اور وہی ان کی دعائے نیم شبی تھی۔ وہ بڑا بخشن ہار ہے۔ شاید یہی ان کا وسیلہ بخشائش بن جائے۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ خود کہا' کسی رانڈ بیوہ سے شادی کر لو۔ بولے' ہاں بھاگوان! کریں گے۔ کہیں دو گز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری برات کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہیں چار کاندھوں پہ ڈولا اترے گا۔ بیوی! مٹی سدا سہاگن ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔

بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھے تو بات کا رخ پھیر دیا۔ وہ اپنی ساری' امیجری' لکڑی' حقے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے۔ بولے' بیوی! یہ رانڈ بیوہ کی قید تم نے کیا سوچ کے لگائی؟ مانا کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں "زن بیوہ مکن اگرچہ حور است۔" مگر تم نے شاید وہ پوربی مثل نہیں سنی۔ پہلے پیوے بھکوا' پھر پیوے تمکوا۔ پیچھے پیوے چلم چاٹ۔ یعنی جو شخص پہلے حقہ پیتا ہے وہ بدھو ہے کہ دراصل وہ تو چلم سلگانے اور تاؤ پر لانے میں ہی جتا رہتا ہے۔ تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حصے میں آتا ہے اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلے ہوئے تمباکو سے خالی بھک بھک کرتا ہے۔

○ جدھر جائیں دہکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی' مگر قبلہ بالکل نہیں چلے۔ زمانے کے تغیر اور گردش پر کس کا زور چلا ہے جو ان کا چلتا۔ حوادث کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہاں' تہذیب حواس سے حوادث کا زور توڑا جا سکتا ہے۔ شخصیت میں پیچ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ نکلنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے۔ کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی' وہ یہاں ایک ہفتے میں آ گئی۔ یہاں تو بزنس کرنا ایسا ہے جیسے سنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا۔ کانپور ہی کے چھٹے ہوئے چھاکٹے یہاں شیر بنے دندناتے پھرتے ہیں۔ اور اچھے اچھے شرفاء ہیں کہ گیدڑ کی طرح دم کٹوا کے بھٹ میں جا بیٹھے۔ ایسا بجوگ پڑا کہ "خود بخود بل میں ہے ہر شخص سمایا جاتا" جو دانا ہیں وہ اپنی دمیں چھپائے بلوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کہا۔

انیس "دم" کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ

ایک دوست نے اپنی آبرو جوکھم میں ڈال کر قبلہ سے کہا کہ گزرا ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ حالات بدل گئے ہیں۔ آپ بھی خود کو بدلیے۔ مسکرائے۔ فرمایا' خربوزہ خود کو گول کر لے تب بھی تربوز نہیں بن سکتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ زمانے کا رخ پہچاننے کی صلاحیت' حلم و بردباری' نرمی اور لچک نہ ان کی سرشت میں تھی' اور نہ زمیندارانہ ماحول اور معاشرے میں ان کا شمار خوبیوں میں ہوتا تھا۔ سختی' خودرائی' تمکنت' خشونت اور جلالی مزاج عیب نہیں' بلکہ فیوڈل کردار کی راستی اور مضبوطی کی دلیل تصور کئے جاتے تھے اور زمیندار تو ایک طرف رہے' اس زمانے کے علماء تک ان اوصاف پر فخر کرتے تھے۔

ہم نہ نکہت ہیں' نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں

قبلہ کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے تو ان کے بہی خواہ میاں انعام الٰہی نے جو اپنی خوردی کے باوصف ان کے مزاج اور معاملات میں در خور رکھتے تھے' عرض کیا کہ دکان ختم کرکے ایک بس خرید لیجئے۔ گھر بیٹھے آمدنی کا وسیلہ ہے۔ روٹ پرمٹ میرا ذمہ۔ آج کل اس دھندے میں بڑی چاندی ہے۔ یکبارگی جلال آ گیا۔ فرمایا' چاندی تو طبلہ سارنگی بجانے میں بھی ہے۔ ایک وضع داری کی ریت بزرگوں سے چلی آ رہی ہے' جس کا تقاضا ہے کہ خراب و خوار ہی ہونا مقدر میں لکھا ہے تو اپنے آبائی اور آزمودہ طریقے سے ہوں گے۔ بندہ ایسی چاندی پر لات مارتا ہے۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے، نہیں لیتے ہم
کونین بھی گو دے ہے، نہیں لیتے ہم
ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے، نہیں دیتا وہ
جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے، نہیں لیتے ہم

○ آخری گالی

کاروبار مندا بلکہ بالکل ٹھنڈا۔ طبیعت زنگ رنگ۔ بے دلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے۔ دکانداری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان بند کر دی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان ملازم زریں گل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا۔ ہر چند غصے کو پینے کی کوشش کرتے، لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے۔ چند ماہ قبل انہوں نے ایک ساٹھ سالہ منشی آدھی تنخواہ پر رکھا تھا، جو گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا جبہ پہنے ننگے پیر زمین پر آلتی پالتی مارے حساب کتاب کرتا تھا۔ کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹھنا اس کے مسلک میں منع تھا۔ وارثی سلسلے کے کسی بزرگ سے بیعت تھا۔ فرض شناس، ایماندار، پابند صوم و صلوٰۃ، زود رنج، کام میں چوپٹ۔ قبلہ نے طیش میں آ کر ایک دن اسے حرام خور کہہ دیا۔ سفید داڑھی کا لحاظ بھی نہ کیا۔ اس نے رسان سے کہا "بجا! حضور کے ہاں جو شے وافر ملتی ہے وہی تو فقیر کھائے گا۔ السلام علیکم۔" یہ جا وہ جا۔ دوسرے دن سے منشی جی نے نوکری پر آنا اور قبلہ نے حرام خور کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن حرام خور کے علاوہ اور بھی تو دل دکھانے والے بتیرے لفظ ہیں۔ زریں گل خان کو سخت سست کہتے کہتے ان کے منہ سے روانی اور سرگرانی میں وہی گالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ کلام ہوا کرتی تھی۔ گالی کی بھیانک گونج درۂ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زریں

گل کی بیوہ ماں رہتی تھی۔ وہ چھ سال کا تھا جب ماں نے بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔
بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ ماں! میں بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کرکے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھیجوں گا۔ اسے آج تک کسی نے یہ گالی نہیں دی تھی۔ جوان خون' غصیلا مزاج۔ پٹھان کی غیرت اور پختو کا سوال تھا۔ زریں گل خان نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "بڈھے! میرے سامنے سے ہٹ جا' نہیں تو ابھی تیرا پیٹ پھاڑ کے کلیجہ کچا چبا جاؤں گا۔ تیرا پلید مردہ بلی پہ لٹکا دوں گا۔"
ایک گاہک نے بڑھ کر چاقو چھینا۔ بڈھے نے جھک کر زمین سے اپنی مخملی ٹوپی اٹھائی اور گرد جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی۔

○ کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا' اب ہم دکان نہیں جائیں گے' کچھ دیر بعد محلے کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کرکے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک سے رہ گئیں کہ خیر تو ہے۔ وہ خود بھی دھک سے رہ گئے۔ اس لیے کہ انہیں دو سورتوں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وتر بھی ادھورے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں۔
وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آدمی اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور یوں ٹوٹتا ہے۔
اور جب ٹوٹتا ہے تو اپنوں بیگانوں سے' حد یہ کہ سب سے بڑے دشمن سے بھی صلح کر لیتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے۔ اسی منزل پر بصیرتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دانش و بینش کے باب کھلتے ہیں۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

ایسے بھی محتاط لوگ ہیں جو پیکار و فشارِ زیست سے بچنے کی خاطر خود کو بے عملی کے حصارِ عافیت میں قید رکھتے ہیں۔ یہ بھاری اور قیمتی پردوں کی طرح لٹکے لٹکے ہی لیر لیر ہو جاتے ہیں۔ کچھ گم صم گمبھیر لوگ اس دیوار کی مانند تڑختے ہیں جس کی مہین سی دراڑ جو عمدہ پینٹ یا کسی آرائشی تصویر سے باآسانی چھپ جاتی ہے' اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نیو اندر ہی اندر کسی صدمے سے زمین میں دھنس رہی ہے۔ بعض لوگ چینی کے برتن کی طرح ٹوٹتے ہیں کہ مسالے سے آسانی سے جڑ تو جاتے ہیں مگر بال اور جوڑ پہلے نظر آتا ہے' برتن بعد میں۔ اس کے برعکس کچھ ڈھیٹ اور چیمڑ لوگ ایسے اٹوٹ مادرے کے بنے ہوتے ہیں کہ چیونگ گم کی طرح کتنا ہی چباؤ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ کھینچنے سے کھنچتے ہیں' چھوڑے سے جاتے ہیں سکڑ۔ آپ انہیں حقارت سے تھوک دیں تو جوتے سے اس بری طرح چپکتے ہیں کہ چھٹائے سے نہیں چھوٹتے۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو دانتوں تلے ہی بھلے تھے کہ پپول تو لیتے تھے۔ یہ چیونگ گم لوگ خود آدمی نہیں' پر آدم شناس ہیں۔ یہ کامیاب و کامران و کامگار لوگ ہیں۔

یہ وہ ہیں جنھوں نے انسان کو دیکھا' پرکھا اور برتا ہے اور جب اسے کھوٹا پایا تو خود بھی کھوٹے ہو گئے۔ وقت کی اٹھتی موج نے اپنے حباب کا تاج ان کے سر پر رکھا اور ساعتِ گزراں نے اپنے تختِ رواں پہ بٹھایا۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ کار کے ونڈ اسکرین کی مانند ہوتے ہیں۔ ثابت و سالم ہیں تو سینۂ عارف کی طرح شفاف کہ دو عالم کا نظارہ کر لو اور یکایک ٹوٹے تو ایسے ٹوٹے کہ نہ بال پڑا' نہ درکے نہ تڑخے۔ یکبارگی ایسے ریزہ ریزہ ہوئے کہ نہ عارف رہا' نہ دو عالم کی جلوہ گری' نہ آئینے کا پتہ کہ کہاں تھا' کدھر گیا' نہ حذر رہا نہ خطر رہا'

جو رہی تو بے خبری رہی۔
اور ایک انا ہے کہ یوں ٹوٹتی ہے جیسے جابر سلطانوں کا اقبال' یا حضرت سلیمان کا عصا جس کی ٹیک لگائے وہ کھڑے تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ لیکن ان کا قالب بے جان ایک مدت تک اسی طرح استادہ رہا اور کسی کو شبہ تک نہ گزرا کہ وہ رحلت فرما چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بے روح کھڑے رہے اور ان کے اقبال اور رعب و دبدبہ سے کاروبار سلطنت حسب معمول سابق چلتا رہا۔ ادھر عصا کو دھیرے دھیرے گھن اندر سے کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ چٹاخ سے ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان کا جسد خاکی فرش زمین پر آ رہا۔ اس وقت ان کی امت اور رعیت پر کھلا کہ وہ دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔
سو وہ دیمک زدہ عصائے پندار و جلال جس کے بل قبلہ نے بے غل و غش زندگی گزاری' آج شام ٹوٹ گیا اور زیست کرنے کا وہ طنطنہ اور ہمہمہ سرنگوں ہوا۔

○ میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

انہیں اس رات نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ ٹمبر مارکیٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور خبر دی کہ "صاحب جی! آپ کی دوکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بجھانے کے انجن تین بجے ہی آ گئے تھے۔ سارا مال کوئلہ ہو گیا۔ صاحب جی! آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑی لگتی ہے۔" وہ جس وقت دکان پر پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جا چکا تھا' جس میں فائر بریگیڈ کی مستعدی اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لیے کچھ رہا نہیں تھا۔ شعلوں کی لپلپاتی دو شاخہ زبانیں کالی ہو چلی تھیں۔ البتہ چیڑ کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے آتشیں آبشار میں نہائی ہوئی تھی۔ مال جتنا تھا سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا۔ عرصہ

ہوا' کانپور میں جب لالہ رمیش چندر نے ان سے کہا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں' گودام کی انشورنس پالیسی لے لو تو انہوں نے ململ کے کرتے کی چنی ہوئی آستین الٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ رہی یاروں کی انشورنس پالیسی!" پھر اپنے ڈنڑ پھلا کر رمیش چندر سے کہا "ذرا چھو کر دیکھو۔" لالہ جی نے اچنبھے سے کہا۔ "لوہا ہے لوہا" بولے۔ "نہیں' فولاد کہو۔"

دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ نہ لب بے سوال پر کوئی لرزش۔ انہوں نے اپنا دفتر کا تالا کھولا۔ انکم ٹیکس کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصے میں جہاں چیڑ سے ابھی شعلے اور خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں' تیز تیز قدموں سے گئے۔ پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا گچھا نذر آتش کیا۔ پھر آہستہ آہستہ دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔ حویلی کا فوٹو دیوار سے اتارا۔ رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ کر چلے آئے۔

بیوی نے پوچھا۔ "اب کیا ہوئے گا؟"

انہوں نے سر جھکا لیا۔

اکثر خیال آتا ہے' اگر فرشتے انہیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہو گی اور کاسنی بادل' تو وہ باب بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو وہ سینہ تانے اس کے قریب جا کر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے۔

"یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔"

○○○

• اسکول ماسٹر کا خواب

○ فیوڈل فینٹسی

ہر شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے اس ٹھاٹ باٹ کا جو دوسروں کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے' وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ بلا شرکت غیرے۔ بالکل نجی' بالکل انوکھا۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی جس آگ سے وہ گزرتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں۔ جیسا داڑھ کا درد مجھے ہو رہا ہے ویسا کسی اور کو نہ کبھی ہوا' نہ ہو گا۔ اس کے برعکس' ٹھاٹ باٹ کا بلو پرنٹ ہمیشہ دوسروں سے چرایا ہوا ہوتا ہے۔ بشارت کے ذہن میں عیش و تنعم کا جو صد رنگ و ہزار پیوند نقشہ تھا وہ بڑی بوڑھیوں کی اس رنگا رنگ رلی کی مانند تھا جو وہ مختلف رنگ کی کترنوں کو جوڑ جوڑ کر بناتی ہیں۔ اس میں اس وقت کا جاگیردارانہ طنطنہ اور ٹھاٹ' بگڑے رئیسوں کا تیہا اور ٹھسا' مڈل کلاس دکھاوا' قصباتی اتروناپن' ملازمت پیشہ نفاست' سادہ دلی اور ندیدہ پن -------- سب بری طرح گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ انہی کا بیان ہے کہ بچپن میں میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ تختی پھینک پھانک' قاعدہ پھاڑ پھوڑ کر مداری بن جاؤں۔ شہر شہر ڈگڈگی بجاتا' بندر' بھالو جھمورا نچاتا اور "بچہ لوگ" سے تالی بجواتا پھروں۔ جب ذرا عقل آئی' مطلب یہ کہ بد اور بدتر کی تمیز پیدا ہوئی تو مداری کی جگہ اسکول ماسٹر نے لے لی۔ اور جب موضع دھیرج گنج میں سچ مچ ماسٹر بن گیا تو میرے نزدیک انتہائے عیاشی یہ تھی کہ مکھن زین کی پتلون' دو گھوڑا بوسکی کی قمیص' ڈبل کفوں میں سونے کے چھٹانک چھٹانک بھر کے بٹن' نیا سولا ہیٹ جس پر میل خورا غلاف نہ چڑھا ہو اور پیٹنٹ لیدر کے پمپ شوز پہن کر اسکول جاؤں اور لڑکوں کو صرف اپنی غزلیات پڑھاؤں۔ سفید سلک کی اچکن

جس میں بدری کے کام والے بٹن زنخرے تک لگے ہوں۔ جیب میں گنگا جمنی کام کی پانوں کی ڈبیا۔ سر پر سفید کمخواب کی رامپوری ٹوپی۔ ترچھی' مگر ذرا شریفانہ زاویے سے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ نرے شریف ہی ہو کے رہ جائیں۔ چھوئی بوئی کی چکن کا سفید کرتا جو موسم کی رعایت سے عطر حنا یا خس میں بسا ہو۔ چوڑی دار پاجامے میں خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کا بنا ہوا سفید ریشمی ازار بند۔ سفید نری کا سلیم شاہی جوتا۔ پیروں پر ڈالنے کے لیے اٹالین کمبل جو فٹن میں جتے ہوئے سفید گھوڑے کی دم اور دور مار بول و براز سے پاجامے کو محفوظ رکھے۔ فٹن کے پچھلے پائیدان پر "ہٹو بچو" کرتا اور اس پر لٹکنے کی کوشش کرنے والے بچوں کو چابک مارتا ہوا سائیس' جس کی کمر پر زردوزی کے کام کی پٹی اور ٹخنے سے گھٹنے تک خاکی نمدے کی نواری پٹیاں بندھی ہوں۔ بچہ اب سیانا ہو گیا تھا۔ بچپن رخصت ہو گیا' پر بچپنا نہیں گیا۔

بچہ اپنے کھیل میں جیسی سنجیدگی اور ہمہ تن محویت اور خود فراموشی دکھاتا ہے' بڑوں کے کسی مشن اور مہم میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ کھلونا ٹوٹنے پر بچے نے روتے روتے اچانک روشنی کی طرف دیکھا تھا تو آنسو میں دھنک جھلمل جھلمل کرنے لگی تھی۔ پھر وہ سبکیاں لیتے لیتے سو گیا تھا۔ وہی کھلونا بڑھاپے میں کسی جادو کے زور سے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو وہ بھونچکا رہ جائے گا کہ اس کے ٹوٹنے پر بھی بھلا کوئی اس طرح جی جان سے روتا ہے۔ یہی حال ان کھلونوں کا ہوتا ہے جن سے آدمی زندگی بھر کھیلتا رہتا ہے۔ ہاں' عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کھلونے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ کو دوسرے توڑ دیتے ہیں۔ کچھ کھلونے پروموٹ ہو کر دیوتا بن جاتے ہیں اور کچھ دیویاں دل سے اترنے کے بعد گودڑ بھری گڑیاں نکلتی ہیں۔ پھر ایک ابھاگن گھڑی ایسی آتی ہے جب وہ ان سب کو توڑ دیتا ہے۔ اس گھڑی وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تراشیدم پرستیدم شکستم

آج ان طفلانہ تمناؤں پر خود ان کو ہنسی آتی ہے۔ مگر یہ اس وقت کی حقیقت تھی۔ بچے کے لیے اس کے کھلونے سے زیادہ ٹھوس اور اصل حقیقت ساری کائنات میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب خواب' خواہ وہ خواب نیم شبی ہو یا خواب بیداری' دیکھا جا رہا ہوتا ہے تو وہی اور صرف وہی اس لمحے کی واحد حاضر و موجود حقیقت ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹا کھلونا' یہ آنسوؤں میں بھیگی پتنگ اور الجھی ہوئی ڈور جس پر ابھی اتنی مار کٹائی ہوئی' یہ جلتا بجھتا جگنو' یہ تنا ہوا غبارہ جو اگلے لمحے ربر کے گلگلے ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا' میری ہتھیلی پہ سرسراتی یہ مخملی بیر بہوٹی' آواز کی رفتار سے بھی تیز چلنے والی یہ ماچس کی ڈبیوں کی ریل گاڑی' یہ صابن کا بلبلا جس میں میرا سانس تھرا رہا ہے' دھنک پر یہ پریوں کا رتھ جسے تتلیاں کھینچ رہی ہیں۔ اس پل' اس آن بس یہی اور صرف حقیقت ہے۔

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

○ کچھ قوس قزح سے رنگ لیا کچھ نور چرایا تاروں سے

یہ قصہ کھلونا ٹوٹنے سے پہلے کا ہے۔

وہ اس زمانے میں نئے نئے اسکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور سیاہ فٹن ان کی تمناؤں کی معراج تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس یونیفارم یعنی سفید اچکن' سفید جوتے' سفید کرتے پاجامے اور سفید ازار بند وغیرہ کی کھکھیڑ فقط خود کو سفید گھوڑے سے میچ کرنے کے لیے تھی۔ ورنہ اس بطخا بھیس پر کوئی بطخ ہی فریفتہ ہو سکتی تھی۔ انہیں چوڑی دار سے بھی سخت چڑ تھی۔ صرف خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے سفید ازار بند کو استعمال کرنے کی خاطر یہ ستار کا غلاف ٹانگوں پر چڑھانا پڑا۔ اس ہوائی قلعے کی ہر اینٹ فیوڈل گارے سے بنی تھی۔ جو بورژوا خوابوں سے گندھا تھا۔ اتنا ہی نہیں کہ ہر اینٹ کا سائز اور رنگ مختلف تھا' ہر ایک پر ان کی ابھرواں شبیہ بھی بنی تھی۔ کچھ اینٹیں گول بھی تھیں'

باریک سے باریک جزئیات' یہاں تک کہ اس حد ادب کا بھی تعین کر دیا تھا کہ ان کے حضور سفید گھوڑی کی دم کتنی ڈگری کے زاویے تک اٹھ سکتی ہے۔ اور ان کی سواری باد بہاری کے "روٹ" پر کس کس جھروکے کی چق کے پیچھے کس کلائی میں کس رنگ کی چوڑیاں چھنک رہی ہیں۔ کس کی ہتھیلی پر ان کا نام (مع بی اے کی ڈگری) مہندی سے لکھا ہے۔ اور کس کس کی سرگیں آنکھیں چلمن سے لگی راہ تک رہی ہیں اور تتلیوں کو بار بار انگلیوں سے چوڑا کر کے دیکھ رہی ہیں کہ کب انقلابی شہزادہ یہ دعوت دیتا ہوا آتا ہے کہ

تم پرچم لہرانا ساتھی' میں بربط پر گاؤں گا

یہاں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اس سے زیادہ محفوظ تقسیم کار اور کیا ہو گی کہ گھمسان کے رن پر پرچم تو محبوب اٹھائے کٹتا مرتا پھرے اور خود شاعر دور کسی مرمریں مینا میں بیٹھا ایک متروک اور دقیانوسی ساز پر ویسا ہی کلام یعنی خود اپنا کلام گا رہا ہو۔ نثر میں اسی سیچوایشن کو دوسرے کی سولی پر چڑھ جانے کی تلقین اور رام بھلی کرنے والی کہاوت میں ذرا زیادہ پھوہڑ ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے۔ لیجیے' مطلع میں ہی سخن گسترانہ بات آ پڑی۔ ورنہ کہنا صرف اتنا تھا کہ مزے کی بات یہ تھی کہ اس سوتے جاگتے خواب کے دوران بشارت نے خود کو اسکول ماسٹر ہی کے "رول" میں دیکھا۔ منصب بدلنے کی خواب میں بھی جرات نہ ہوئی۔ شاید اس لیے بھی کہ فٹن اور ریشمی ازار بند سے صرف اسکول ماسٹروں پر ہی رعب پڑ سکتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے لیے یہ چیزیں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ انہیں اپنی پیٹھ پر بیس برس بعد بھی اس آتشیں لکیر کی جلن محسوس ہوتی

تھی جو چابک لگنے سے اس وقت اڑی تھی جب محلے کے لونڈے کے ساتھ شور مچاتے‘ چابک کھاتے وہ ایک رئیس کی سفید گھوڑے والی فٹن کا پیچھا کر رہے تھے۔

○ چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر

شعر و شاعری چھوڑ کر اسکول ماسٹری اختیار کی۔ اسکول ماسٹری کو دھتا بتا کر دکانداری کی۔ اور آخر کار دکان بیچ کھوچ کر کراچی آ گئے‘ جہاں ہرچند رائے روڈ پر دوبارہ عمارتی لکڑی کا کاروبار شروع کیا۔ نیا ملک‘ بدلا بدلا سا رہن سہن۔ ایک نئی اور مصروف دنیا میں قدم رکھا۔ مگر اس سفید گھوڑے اور فٹن والی فینٹسی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خواب نیم روز (Day Dreaming) اور فینٹسی سے دو ہی صورتوں میں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اول‘ جب وہ فینٹسی نہ رہے‘ حقیقت بن جائے۔ دوم‘ انسان کسی چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر اپنے سوتے جاگتے ہمزاد سے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔

Heart Breaker, Dream Maker, thankyou for the dream!

اور اس گھونٹ نکل جائے جہاں سے کوئی نہیں لوٹا‘ یعنی گھر گرہستی کی طرف۔ لیکن بشارت کو اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا۔ وہ بھرا پرا گھر اونے پونے بیچ کر اپنے حسابوں لٹے پٹے آئے تھے۔ پاکستان میں ایک دو سال میں ہی اللہ نے ایسا فضل کیا کہ کانپور ہیچ معلوم ہونے لگا۔ سارے ارمان پورے ہو گئے۔ مطلب یہ کہ گھر اشیائے غیر ضروری سے اٹا اٹ بھر گیا۔ بس ایک کمی تھی؟

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے گھوڑے کے سوا

اب وہ چاہتے تو نئی نہ سہی‘ سیکنڈ ہینڈ کار باآسانی خرید سکتے

تھے۔ جتنی رقم میں آج کل چار ٹائر آتے ہیں' اس سے کم میں اس زمانے میں کار مل جاتی تھی۔ لیکن کار میں انہیں وہ رئیسانہ ٹھاٹ اور زمیندارانہ ٹھسا نظر نہیں آتا تھا جو فٹن اور بگھی میں ہوتا ہے۔ گھوڑے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

○ گھوڑے کے ساتھ شجاعت بھی گئی

مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ آدمی جب بالکل جذباتی ہو جائے تو اس سے کوئی عقل کی بات کہنا ایسا ہی ہے جیسے بگولے میں بیج بونا۔ چنانچہ بشارت کو اس شوق فضول سے باز رکھنے کے بجائے انہوں نے الٹا خوب چڑھایا۔ ایک دن آگ کو پٹرول سے بجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب سے گھوڑا رخصت ہوا' دنیا سے شجاعت و سرفروشی' جاں بازی اور دلاوری کی ریت بھی اٹھ گئی۔ جانوروں میں کتا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور پکے رفیق ہیں جنہوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل چھوڑا۔ کتا تو خیر اپنے کتے پن کی وجہ سے چمٹا رہا' لیکن انسان نے گھوڑے کے ساتھ بیوفائی کی۔ گھوڑے کے جانے سے انسانی تہذیب کا ایک ساونتی باب ختم ہوتا ہے۔ وہ باب' جب سورما اپنے دشمن کو للکار کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے لڑتے تھے۔ موت ایک نیزے کی دوری پر ہوتی تھی اور یہ نیزہ دونوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ موت کا ذائقہ اجنبی سہی' لیکن مرنے والا اور مارنے والا دونوں ایک دوسرے کا چہرہ پہچان سکتے تھے۔ غافل سوتے ہوئے' بے چہرہ شہروں پر مشروم بادل کی اوٹ سے آگ اور ایٹمی موت نہیں برستی تھی۔ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہو جاتا ہے جب اس کا سوار بزدل ہو۔ بہادر گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ دل دھک دھک کرتے اور دھرتی تھرتھراتی تھی۔ پیچھے دوڑتے ہوئے بگولے' سموں سے اڑتی چنگاریاں نیزوں کی انی پر کرن کرن بکھرتے سورج اور سانسوں کی ہانپتی آندھیاں کوسوں دور سے شہ سواروں کی یلغار کا اعلان کر دیتی تھیں۔ گھوڑوں کے ایک

ساتھ دوڑنے کی آواز سے آج بھی لہو میں ہزاروں سال پرانی وحشتوں کے الاؤ بھڑک اٹھتے ہیں۔
لیکن مرزا ذرا ٹھہرو، اپنے توسن خطابت کو لگام دو۔ یہ کس گھوڑے کا ذکر کر رہے ہو؟ تانگے کے گھوڑے کا؟

○ گل جی کے گھوڑے

لیکن یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ گھوڑے کے بغیر طالع آزمائی، ملک گیری، شجاعت اور "شولری" کے عہد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ "گھوڑے کی کاٹھی ہی ہمارا راج سنگھاسن ہے۔" گائیکواڑوں کو اپنے قدیم شاہی "ماٹو" پر بڑا ناز تھا۔ یورپ کو تاخت و تاراج کرنے والے ہن شہ سواروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی گھوڑے سے نہیں اترتے تھے۔ اس کی پیٹھ پر ہی سوتے، ستاتے، کھاتے، شراب نوشی اور خرید و فروخت کرتے، یہاں تک حوائج ضروری سے فارغ ہوتے۔ انگلینڈ میں اسٹب نامی ایک آرٹسٹ گزرا ہے جو صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے پینٹ کرتا تھا۔ یورپ میں گھوڑوں، کتوں اور رائلٹی کی حد تک ولدیت اور شجرۂ نسب اب بھی تھوڑے بہت معنی رکھتے ہیں۔ گھوڑے کو برہنہ ماڈلوں پر ترجیح دینے کی وجہ ہمیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے دم نہیں ہوتی۔ اس میں یہ عافیت بھی تھی کہ گھوڑا کبھی مطالبہ نہیں کرتا کہ تصویر اصل کے مطابق نہ ہو، بہتر ہو۔ ہم پاکستان کے ممتاز اور نامور آرٹسٹ گل جی کے گیارہ سال دیوار بیچ پڑوسی رہ چکے ہیں۔ انہیں بہت قریب سے پینٹ کرتے دیکھا ہے۔ وہ صرف رات کو، اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد پینٹ کرتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید انہیں رات میں بہتر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب سے خود ہم نے السر کی تکلیف کے سبب رات کو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ہمسائے کے بارے میں بدگمانی سے کام لینا چھوڑ دیا۔

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

انہیں بھی گھوڑوں سے بے انتہا شغف ہے۔ ان کی تصویریں بنا کے لاکھوں کماتے ہیں۔ سنا ہے ایک دفعہ کسی نے (ہم نے نہیں) مذاق میں کہہ دیا کہ جتنے کی آپ ایک گھوڑے کی تصویر بیچتے ہیں، اس میں تو تین زندہ گھوڑے باآسانی آسکتے ہیں۔ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اس کے بعد وہ کینوس پر کم از کم تین گھوڑے بنانے لگے۔ یہ بھی دیکھا کہ جتنے پیار، تفصیل وار موشگافی اور انسپریشن سے وہ گھوڑے کی دم بناتے ہیں، اس کا سوواں حصہ بھی گھوڑے اور سوار پر صرف نہیں کرتے۔ صرف گھوڑے ہی کی نہیں، سواری کی بھی ساری پرسنلٹی کھنچ کر دم میں آ جاتی تھی۔ چنانچہ ہر دم منفرد، البیلی اور انمول ہوتی ہے۔ دل کی بات پوچھئے تو وہ فقط دم ہی بنانا چاہتے ہیں۔ باقیماندہ گھوڑا نہیں فقط دم کو اٹکانے کے لیے طوعاً و کرہاً بنانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی وی آئی پی خاتون کی پورٹریٹ خاص توجہ سے بہت ہی خوبصورت بنانی مقصود ہوتی تو اس کے بالوں کی پونی ٹیل بطور خاص ایسی بناتے تھے کہ کوئی گھوڑا دیکھ لے تو بے قرار ہو ہو جائے۔

○ بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط دم

یوں بنانے کو تو انہوں نے البیلے اونٹ بھی بکثرت بنائے ہیں اور الٹے بانس بریلی بھیجے ہیں۔ یعنی درجنوں کے حساب سے عرب ممالک کو روغنی اونٹ ایکسپورٹ کئے ہیں۔ ان

کے بعض اونٹ تو اتنے مہنگے ہیں کہ صرف بینک' شیوخ' غیر ملکی سفارت کار اور مقامی اسمگلر ہی خرید سکتے ہیں۔ یونائیٹڈ بینک نے ان سے جو نایاب اونٹ خریدے وہ اتنے بڑے نکلے کہ ان کے ٹانگنے کے لیے ہال کے بیچوں بیچ ایک دیوار علیحدہ سے بنوانی پڑی لیکن انہیں دیکھ کر شیوخ اتنے خوش ہوئے کہ بعض نے اصل یعنی بالکل انہی جیسے اونٹوں کی فرمائش کر دی۔ اب بینک اس مخمصے میں پڑ گیا کہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پٹرو ڈالر ڈپازٹ کے لالچ میں بینک کو ان سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے والے اونٹ تلاش کر کے چارے سمیت ایکسپورٹ کرنے پڑے۔ جب ہم یونائیٹڈ بینک سے متعلق و منسلک ہوئے تو ایک دن ہمت کر کے گل جی سے کہا کہ حضور اگر آپ آئندہ ایسے اونٹ بنائیں جو اس عالم آب و گل میں باآسانی دستیاب ہو جایا کریں تو بینک کو شیوخ کی فرمائش پوری کرنے میں آسانی رہے گی۔ نوکری کا سوال ہے۔ اور ہاں ان پر کبھی کسی بے پردہ خوبصورت عورت کو سوار نہ دکھائیں۔ گل جی بلا کے ذہین' زود رنج اور حاضر جواب آرٹسٹ ٹھہرے۔ بہت منغض ہوئے۔ پھر کچھ خیال آیا تو سنبھل کر انگریزی میں بولے۔ "بابا ہم سیدھے سادے اسماعیلی آغا خانی مزدور' تابعدار' مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں آئل پینٹ کو بد چلن اونٹنی کے دودھ میں مکس کر کے کنواری گھوڑی کی دم کے بالوں کے برش سے اونٹ بناؤں۔ لاگت اور قیمت دگنی ہو جائے گی۔ سوچ لیجئے۔ (اردو میں) صاحب آپ فقیروں سے مسخری کرتے ہیں۔ پکاسو کہتا

ہے کہ پینٹنگ اندھوں کا پیشہ ہے۔ آرٹسٹ وہ پینٹ نہیں کرتا جو وہ دیکھتا ہے، بلکہ جو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔" ہم نے ان کے طنز کا برا نہیں مانا۔ اول تو ------- "مرد دانا پر کلام گرم و گنجلک بے اثر" دوسرے، ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ تین چار سو سال پرانی راجپوت پینٹنگ میں جو شوخ اور نایاب ہلدی سے بھی پیلا رنگ نظر آتا ہے، وہ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ پہلے گائے کو مسلسل کئی دن آم کے پتے کھلاتے۔ پھر اس کے پیشاب سے یہ پیلا رنگ بناتے تھے۔ یہی رنگ پکے ہوئے رس بھرے آموں، بسنتی چولیوں اور راجاؤں کی پر غرور پگڑیوں میں بھرتے تھے۔

بہر کیف گل جی کے اونٹ میں وہ گھوڑے والی بات پیدا نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے! کہاں گھوڑے کی تا بہ زانو گھنیری چنور شاہی دم، کہاں اونٹ کی پونچھڑی! دم نہیں دم کا ٹوٹا کہیے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس سے تو ڈھنگ سے شتر پوشی بھی نہیں ہو سکتی۔ ہر جانور کی دم کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً لنگور کی دم درختوں سے لٹکنے اور گدرائے ہوئے پھل اور مادہ پر کمند ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آقا کے سامنے بے اختیار ہلنے والی کتے کی دم پچھلے جنم میں کسی مصاحب کی زبان تھی۔ کتا اس کام کے لیے اپنی زبان استعمال نہیں کرتا۔ شتر مرغ کی دم مغربی خواتین کی سر کی زینت کے لیے بنی ہے۔ بعضے جانور کو دم محض اس لیے دی گئی ہے کہ دکھیا کے پاس دبا کر بھاگنے کے لیے کچھ تو ہو۔ دانا اس رمز کو جانتے ہیں کہ بعض اوقات غریب کو مونچھ صرف اس لیے رکھنی پڑتی ہے کہ بوقت ضرورت نیچی کر کے جان کی امان پائے۔ مور کی دم شہریوں کو ناچ دکھانے کے لیے نہیں، بلکہ جنگل میں مورنی کو رجھانے اور پیروں کے مزاروں پر جاروب کشی کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ لالچ نہ ہوتا تو ذرا سے جثے پر اتنا جھاڑ جھنکاڑ کاہے کو اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ ذرا ایک لحظہ کے لیے آنکھ بند کر کے غور فرمائیے، مور کو اگر شیو کر دیا جائے تو بالکل الو معلوم ہو گا۔

○ افضل ترین دم

لیکن اونٹ کی دم سے مادہ کو رجھانا تو درکنار' کسی بھی معقول یا نامعقول جذبے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو تو ٹھیک سے لٹکنا بھی نہیں آتا۔ سچ پوچھے تو بس مور' برڈ آف پیراڈائز اور کیسینو کی Bunnies کی ہوتی ہے۔ آخر الذکر ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی' اور اس کا مقصد آدمی کے اندر سوئے ہوئے اور ہارنے والے خرگوش کو گدگدا کر جگانا ہے۔ برڈ آف پیراڈائز چکور کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن نر کی دم' خدا جھوٹ نہ بلوائے' پندرہ پندرہ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اگر بہت سے نر اونچے اونچے درختوں پر اپنی متعلقہ دمیں لٹکائے امیدوار کرم بیٹھے ہوں تو مادہ ان کی شوہرانہ اہلیت جانچنے کے لیے وہی پیمانہ استعمال کرتی ہے جس سے اگلے زمانے میں علماء و فضلاء کا علم ناپا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ فقط معلّمات یعنی داڑھی' شملہ اور دم کی لمبائی پر فیصلے کا انحصار۔ جس کی دم سب سے لمبی ہو' مادہ اسی کے پرلے سرے پر لگی ہوئی منی سی چونچ میں اپنی چونچ ڈال دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بامقصد دم بچھو کی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر کچلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں رہتا ہے اور پاگل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔ لکھتے لکھتے یوں ہی خیال آیا کہ ہم بچھو ہوتے تو کس کس کو کاٹتے۔ اپنے ناپسندیدہ اشخاص کی فہرست کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایک زندگی تو اس مشن کے لیے بالکل ناکافی ہوتی۔ لیکن یہاں تک نوبت ہی نہ آتی' اس لیے کہ ہمارے معتوبین کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ رہی سانپ کی دم' تو وہ ہمیں پسند تو نہیں' Fascinate ضرور کرتی ہے۔ اس میں وہی خوبی پائی جاتی ہے جو ہماری پیشانی میں ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ پھن کو چھوڑ کر ہمیں تو سارا سانپ دم ہی دم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ و افضل وہ دم قرار پائے گی جو جھڑ چکی ہے۔ اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفہ

الارض کا درجہ ملا ہے۔

○ ہماری سواری ○ کیلے کا چھلکا

فٹن اور گھوڑے سے بشارت کی شیفتگی کا ذکر کرتے کرتے ہم کہاں آ نکلے۔ مرشدی و آقائی مرزا عبدالودود بیگ نے ایک دفعہ بڑے تجربے کی بات کہی۔ فرمایا۔ "جب آدمی کیلے کے چھلکے پر پھسل جائے تو پھر رکنے' بریک لگانے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس سے اور زیادہ چوٹ آئے گی۔ بس آرام سے پھسلتے رہنا چاہیے اور پھسلنے کو انجوائے کرنا چاہیے۔ بقول تمہارے استاد ذوق کے' تم بھی چلے چلو یہ جہاں تک چلی چلے۔ کیلے کا چھلکا جب تھک جائے گا تو خود بخود رک جائے گا۔ Just Relax --------
لہذا قدم ہی نہیں' قلم یا نگاہ تصور بھی پھسل جائے تو ہم اسی اصول پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ صاف صاف کیوں نہ اقرار کرلیں کہ زندگی کے طویل سفر میں کیلے کا چھلکا ہی ہماری واحد سواری رہا ہے۔ یہ جو کبھی کبھی ہماری چال میں جوانوں کی سی تیزی اور صحت مند چلت پھرت آ جاتی ہے تو یہ اسی کے طفیل ہے۔ ایک دفعہ رپٹ جائیں تو پھر یہ قلم چال جو بھی کنویں جھنکوائے اور جن گلیوں گلیاروں میں لے جائے وہاں بے ارادہ لیکن برغبت جاتے ہیں۔ قلم کو روکنے تھامنے کی ذرا کوشش نہیں کرتے۔ اور جب بیروں کی پوٹ پھٹ کر کاغذ پر بکھر جاتی ہے تو ہماری مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جس کی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی جیب کے تمام رازوں کو کوئی اچانک نکال کر سب کے سامنے میز پر نمائش لگا دے۔ زیادہ خفت بڑوں کو ہوتی ہے کہ انہیں اپنا بھولا بسرا بچپن اور اپنی موجودہ میز کی درازیں یاد آ جاتی ہیں۔ جس دن بچے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے پیسے برآمد ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی نصیب نہیں ہو گی۔

○ ریس کورس سے تانگے تک

جیسے جیسے بزنس میں منافع بڑھتا گیا فٹن کی خواہش بھی شدید تر ہوتی گئی۔ بشارت مہینوں گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھوڑے کے بغیر ان کے سارے کام بند ہیں۔ اور بادشاہ رچرڈ سوم کی طرح وہ ہر چیز گھوڑے کی خاطر تج دینے کے لیے تیار ہیں۔

A Horse! a horse! my kingdom for a horse!

ان کے پڑوسی چودھری کرم الٰہی نے مشورہ دیا کہ ضلع سرگودھا کے پولیس اسٹڈ فارم سے رجوع کیجئے۔ وہاں پولیس کی نگرانی میں، تھارو بریڈ اور اعلیٰ ذات کے گھوڑوں سے افزائش نسل کروائی جاتی ہے۔ گھوڑے کا باپ خالص اور اصیل ہو تو بیٹا لا محالہ اسی پر پڑے گا۔ مثل ہے کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر بشارت کہنے لگے کہ "میرا دل نہیں ٹھکتا۔ بات یہ ہے کہ جس گھوڑے کی پیدائش میں پولیس کا عمل دخل ہو، وہ خالص ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ گھوڑا پولیس پر پڑے گا۔"

گھوڑے کے بارے میں یہ گفتگو سن کر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی نے وہ مشہور شعر پڑھا اور حسب معمول بے محل پڑھا، جس میں دیدۂ ور کی ولادت سے رونما ہونے والی پیچیدگیوں کے ڈر سے نرگس ہزاروں روتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس اپنی دانست میں کوئی بہت ہی دانائی کی بات کہنے کے لیے اگر بیچ میں بولیں تو بیوقوف معلوم ہوتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو اپنے چہرے کے نارمل ایکسپریشن کے سبب اور زیادہ بیوقوف لگتے ہیں۔ گویا "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

پروفیسر مذکور کے نارمل ایکسپریشن سے مراد چہرے پر وہ رنگ ہیں جو اس وقت آتے اور جاتے ہیں جب کسی کی زپ ادھ بیچ میں اٹک جاتی ہے۔

خدا خدا کر کے ایک گھوڑا پسند آیا جو ایک اسٹیل ری رولنگ مل کے سیٹھ کا تھا۔ تین چار دفعہ اسے دیکھنے گئے اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ مطمئن لوٹے۔ اس کا سفید رنگ

ایسا بھایا کہ اٹھتے بیٹھتے اسی کے چرچے' اسی کے قصیدے۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا۔ "پچ کلیان ہے؟" حقارت آمیز انداز سے ہنسے۔ فرمایا "پچ کلیان تو بھینس بھی ہو سکتی ہے' فقط چہرہ اور ہاتھ پیر سفید ہونے سے گھوڑے کی دم میں سرخاب کا پر نہیں لگ جاتا۔ گھوڑا وہ جو آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ چاروں ٹخنوں اور چاروں گھٹنوں کے جوڑ مضبوط ہونے چاہئیں۔ یہ بھاڑے کا ٹٹو نہیں' ریس کا خاندانی گھوڑا ہے۔" یہ گھوڑا ان کے اعصاب پر اس بری طرح سوار تھا کہ اب اسے ان پر سے کوئی گھوڑی ہی اتار سکتی تھی۔

سیٹھ نے انہیں ایسوسی ایٹڈ پرنٹرز میں طبع شدہ کراچی کلب کا وہ کتابچہ بھی دکھایا جو اس ریس سے متعلق تھا جس میں اس گھوڑے نے حصہ لیا اور اول آیا تھا۔ اس میں اس کی تصویر اور تمام کوائف مع شجرۂ نسب درج تھے۔

نام White Rose ولد Wild Oats ولد Old Devil۔ جب سے یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیکھا' انہوں نے اپنے ذاتی بزرگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس کے دادا نے بمبئی میں تین ریسیں جیتیں۔ چوتھی میں دوڑتے ہوئے ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی دادی بڑی نرچگ تھی۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی ولایتی گھوڑوں سے اس کا تعلق رہ چکا تھا۔ اس کے دامن عصمت سے تمسک و تمتع کی بدولت چھ نرینہ اولادیں ہوئیں۔ ہر ایک اپنے متعلق باپ پر پڑی۔ سیٹھ سے پہلے وہائٹ روز ایک بگڑے رئیس کی ملکیت تھا جو باتھ آئی لینڈ میں ایک کوٹھی "ونڈر لینڈ" نام کی اپنی اینگلو انڈین بیوی ایلس کے لیے بنوا رہا تھا۔ ری رولنگ مل سے جو سریا وہ خرید کر لے گیا تھا اس کی رقم کئی مہینے سے اس کے نام کھڑی تھی۔ ریس اور سٹے میں دوالا نکلنے کے سبب ونڈر لینڈ کی تعمیر رک گئی اور ایلس اسے حیرت زدہ چھوڑ کر ملتان کے ایک زمیندار کے ساتھ یورپ کی سیر کو چلی گئی۔ سیٹھ کو ایک دن جیسے ہی خبر ملی کہ ایک قرض خواہ اپنے واجبات کے عوض پلاٹ پر پڑی ہوئی سیمنٹ کی بوریاں اور سریا اٹھوا کے لے گیا۔ اس نے اپنے مینجر کو پانچ لٹھ بند چوکیداروں کی نفری ساتھ لے کر باتھ آئی لینڈ بھیجا کہ بھاگتے بھوت کی جو چیز بھی ہاتھ لگے کھسوٹ لائیں۔ لہٰذا وہ یہ گھوڑا اصطبل سے کھول

لائے۔ وہیں ایک سیامی بلی نظر آ گئی۔ سو اسے بھی بوری میں بھر کے لے آئے۔ گھوڑے کی ٹریجڈی کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لیے بشارت نے ضمناً ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ فرمایا۔ "یہ گھوڑا تانگے میں جتنے کے لیے تھوڑا ہی پیدا ہوتا تھا۔ سیٹھ نے بڑی زیادتی کی۔ مگر قسمت کی بات ہے۔ صاحب تین سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ آپ یوں بینک میں جوت دیئے جائیں گے۔ کہاں ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی اور کہاں بینک کا چار فٹ اونچا اسٹول"

○ شاہی سواری

انہیں اس گھوڑے سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ اور محبت اندھی ہوتی ہے، خواہ گھوڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ تک سجھائی نہ دیا کہ گھوڑے کی مدح میں اساتذہ کے جو اشعار وہ اوٹ پٹانگ پڑھتے پھرتے تھے، ان کا تعلق تانگے کے گھوڑے سے نہیں تھا۔ یہ مان لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ گھوڑا شاہی سواری ہے۔ رعب شاہی اور شوکت شہانہ کا تصور گھوڑے کے بغیر ادھورا بلکہ بالکل آدھا رہ جاتا ہے۔ بادشاہ کے قد میں گھوڑے کے قد کا اضافہ کیا جائے تب کہیں وہ قد آدم نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دل پسند سواری در حقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پر سواری گانٹھ لیں تو پھر انہیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، باڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوش شہ زوری و شہ سواری میں نوشتہ دیوار والی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ یہ نوشتہ دیوار اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے جب تک وہ Braille میں نہ لکھا ہو۔ جسے وہ اپنا دربار سمجھتے ہیں، وہ دراصل ان کا محاصرہ ہوتا ہے۔ جو انہیں یہ سمجھنے سے قاصر رکھتا ہے کہ جس منہ زور سر شور گھوڑے کو صرف ہنہنانے کی اجازت دے کر باآسانی آگے سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے، اسے وہ پیچھے سے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ لگام کے بجائے دم مروڑتا ہے۔ مگر اس بظاہر

مسکین سواری کا اعتبار نہیں کہ یہ ابلق لقا سدا ایک چال نہیں چلتی۔
اکثر یہ بد رکاب بنی اور بگڑ گئی

○ غربا کشتن روز اول

لیکن جو حکمراں ہوشیار، مردم شناس اور رموز و مصلحت مملکت سے آشنا ہوتے ہیں، وہ پہلے ہی دن غریبوں کی سرکوبی کر کے خواص کو عبرت دلاتے ہیں۔

غربا کشتن روز اول
ویسے خواص اور عمائد کو کسی تنبیہہ اور آنکس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو بھی ان پر سونے کی عماری، چاندی کی گھنٹیاں، زر بفت کی جھول اور تمغوں کی مالا ڈال دے، اسی کا نشان کا ہاتھی بننے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔ پہلے کمر بستہ و دست و پا بستہ، پھر لب بستہ اور آخر میں فقط بستہ بردار۔
چار دن کی زندگی ملی تھی۔ سو دو آرزوئے حضوری میں کٹ گئے۔ دوجی حضوری میں۔

○ ہمارا کجاوہ

ہم نے ایک دن گھوڑوں کی جناب میں کچھ گستاخی کر دی تو بشارت بھنا گئے۔ ہم نے بر سبیل تضحیک ایک تاریخی حوالہ دیا تھا کہ جب منگول ہزاروں کے غول بنا کر گھوڑوں پر نکلتے تو بدبو کے ایسے بھبکے اٹھتے تھے کہ بیس میل دور سے پتہ چل جاتا تھا۔ ارشاد فرمایا، معاف کیجئے، آپ نے راجستھان میں، جہاں آپ نے جوانی گنوائی، اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پر کلف دار راجپوتی صافے، چڑھواں داڑھیاں اور دس فٹ لمبی نال

والی توڑے دار بندوقیں بجی ہوتی تھیں اور نیچے' کندھے پہ رکھی لاٹھی کے سرے پر تیل پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جوتے لٹکائے' اردلی میں ننگے پیر جاٹ۔ گھوڑا تو آپ نے

پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الٰہی گواہ ہیں' انہی کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصہ سنایا تھا جو مہاراجہ کی شتر نال پلٹن میں رسالدار تھے۔ جب ریٹائر ہو کر اپنے آبائی قصبے' کیا نام تھا اس کا ------- اودے پور تورا واٹی پہنچے تو اپنی گڑھی میں ملاقاتیوں کے لیے دس بارہ مونڈھے ڈلوا دیئے اور اپنے لیے اپنے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا پرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی پلٹن کا شنگرفی رنگ کا صافہ باندھے' سینے پر تمغے سجائے صبح سے شام تک بیٹھے ہلتے رہتے۔ ایک دن ہل ہل کر جنگ بہادر کے کارنامے بیان کر رہے تھے اور میڈل جھن جھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ کجاوے پر ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے عمودی سفر پر روانہ ہو گیا۔ دم واپسیں لبوں پر مسکراہٹ اور جنگ بہادر کا نام۔ معاف کیجئے' یہ سب آپ ہی کے لیے ہوئے اسنیپ شاٹس ہیں۔ بندہ پرور! آپ بھی تو اپنے کجاوے سے نیچے نہیں اترے' نہ اتریں۔ مگر یہ کجاوہ خاکسار کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہے۔ صاحب' آپ گھوڑے کی قدر کیا جانیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ سمند سیاہ زانو کس چڑیا کا نام ہے' خچر کا کراس کیسے ہوتا ہے' کھریرا کس شکل کا ہوتا ہے' کنوتیاں کہاں ہوتی ہیں' بیل کے آر کہاں چبھوئی جاتی ہے' چلغوزہ کس زبان کا لفظ ہے؟

آخری دو سوال کلیدی اور فیصلہ کن تھے۔ اس لیے کہ ان سے پتہ چلتا تھا کہ بحث کس نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ کج بحثی ہمیں اس لیے اور بھی ناگوار گزری کہ ہمیں ایک بھی سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ وہ "اوکھے" نہیں' طبعاً بہت دھیمے اور میٹھے آدمی ہیں۔ لیکن جب وہ اس طرح پٹڑی سے اتر جائیں تو ہمیں دور تک کچے میں کھدیڑتے' گھسیٹتے لے جاتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھتا' وہ کبھی سیر چشم' غیور اور شیر دلیر نہیں ہو سکتا۔" ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس لیے کہ

وہ خود بھی کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھے تھے۔

○ جنازے سے دور رکھنا

انہیں ایک عرصے سے زندگی میں جو روحانی خلا محسوس ہو رہا تھا' وہ اس گھوڑے نے پر کر دیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس کے بغیر اب تک کیسے بلکہ کاہے کو جی رہے تھے۔

I wonder by my troth what thou and I did till we loved ..... Donne

اس گھوڑے سے ان کی شیفتگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ فٹن کا خیال چھوڑ کر سیٹھ کا تانگہ بھی ساڑھے چار سو روپے میں خرید لیا' حالانکہ انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ بہت بڑا اور گنوارو تھا۔ لیکن کیا کیا جائے' سارے کراچی میں بھی ایک بھی فٹن نہیں تھی۔ سیٹھ گھوڑا اور تانگہ ساتھ بیچنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں' اس نے دانے کی دو بوریوں' گھاس کے پانچ پولوں' گھوڑے کے فریم کئے ہوئے فوٹو' ہاضمے کے نمک' دوا اور تیل پلانے کی نال' کھریرے اور توبڑے کی قیمت ساڑھے انتیس روپے علیحدہ دھروالی۔ وہ اس دھاندلی کو "پیکج ڈیل" کہتا تھا۔ گھوڑے کے بھی منہ مانگے دام دینے پڑے۔ گھوڑا گر اپنے منہ سے دام مانگ سکتا تو یقیناً سیٹھ کے مانگے ہوئے داموں یعنی نو سو روپے سے کم ہی ہوتے۔ گھوڑے کی خاطر بشارت کو سیٹھ کا تکیہ کلام "کیا؟" اور "سالا" بھی برداشت کرنا پڑا۔ چکتا حساب کر کے جب انہوں نے لگام اپنے ہاتھ میں تھام لی اور یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کے خواب کی تعبیر نہیں چھین سکتی تو انہوں نے سیٹھ سے پوچھا کہ آپ نے اتنا اچھا گھوڑا کیوں بیچ دیا؟ کوئی عیب ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "دو مہینے پہلے کی بات ہے' میں تانگے میں لارنس روڈ سے لی مارکیٹ جا رہا تھا۔ میونسپل ورکشاپ کے پاس پہنچا ہوں گا کہ سامنے سے ایک سالا جنازہ آتا دکھلائی پڑا' کیا؟ کسی پولیس افسر کا تھا۔ گھوڑا آل آف اے سڈن بدک گیا۔ پر کندھا دینے

والے اس سے بھی زیادہ بدکے۔ بے فضول ڈر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا؟ بیچ سڑک پہ جنازے کی مٹی خراب ہوئی۔ ہم سالا الو کے موافق بیٹھا دیکھتا پڑا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن' بیکار بندھا کھا رہا ہے۔ دل سے اتر گیا۔ کیا؟ ویسے عیب کوئی نہیں۔ بس جنازے سے دور رکھنا اچھا' سلاما لیکم!"

"آپ نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم نے پہلے کیوں نہیں پوچھا؟ سلاما لیکم"

جگ میں چلے پون کی چال

انہوں نے ایک کوچوان رحیم بخش نامی ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ منہ مانگی' یعنی پینتالیس روپے اور کھانا کپڑا۔ گھوڑا انہوں نے صرف رنگ' دانت اور گھنیری دم دیکھ کر خریدا تھا۔ اور وہ ان حصوں سے اتنے مطمئن تھے کہ باقیماندہ گھوڑے کی جانچ پڑتال ضروری نہ سمجھی۔ کوچوان بھی کچھ اسی طرح رکھا۔ یعنی صرف زبان پر ریجھ کر۔ باتیں بنانے میں طاق تھا۔ گھوڑے جیسا چہرہ۔ ہنستا تو معلوم ہوتا گھوڑا ہنہنا رہا ہے۔ تیس سال گھوڑوں کی صحبت میں رہتے رہتے ان کی تمام عادتیں' عیب اور بدبوئیں اپنا لی تھیں۔ گھوڑے کے اگر دو ٹانگیں ہوتیں تو یقیناً اسی طرح چلتا۔ بچوں کو اکثر اپنا بایاں کان ہلا کر دکھاتا۔ فٹ بال کو ایڑی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرتا تو بچے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ گھوڑے کے چنے کی چوری کرتا تھا۔ بشارت کہتے تھے۔ "یہ منحوس چوری چھپے گھاس بھی کھاتا ہے' ورنہ ایک گھوڑا اتنی گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔ جبھی تو اس کے بال ابھی تک کالے ہیں۔ دیکھتے نہیں' حرام خور تین عورتیں کر چکا ہے۔" موضوع کچھ بھی ہو تمام تر گفتگو سائیس اصطلاحوں میں کرتا اور رات کو چابک لے کر سوتا۔ دو میل کے دائرے میں کہیں بھی گھوڑا یا گھوڑی ہو' وہ فوراً بو پا لیتا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے۔ راستے میں کوئی خوبصورت گھوڑی نظر آ جائے تو وہیں رک جاتا اور آنکھ

مار کے تانگے سے اس کی عمر پوچھتا۔ پھر اپنے گھوڑے کا چرمی چشم بند اٹھاتے ہوئے کہتا۔ "پیارے تو بھی جلوہ دیکھ لے' کیا یاد کرے گا۔" اور پنکج ملک کی آواز' اپنی لے اور گھوڑے کی ٹاپ کی تال پر "جگ میں چلے پون کی چال" گاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ مرزا کہتے تھے کہ یہ شخص پچھلے جنم میں گھوڑا تھا اور اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہی ہو گا۔ یہ سعادت صرف مہاتماؤں اور رشیوں منیوں کو حاصل ہوتی ہے کہ جو وہ پچھلے جنم تھے' اگلے میں بھی وہی ہوں۔ ورنہ ہما شما کی تو ایک ہی دفعہ میں جون پلٹ جاتی ہے۔

○ دست بدایوار وان گیا

گھوڑے تانگے کا افتتاح کہئے' مہورت کہئے' Breaking-in کہئے۔ اس کی رسم بشارت کے والد نے انجام دی۔ ستر کے پیٹے بلکہ لپیٹے میں آنے کے بعد مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے' مگر نہ کوئی مکان اور جائیداد الاٹ کرا سکے' نہ کوئی ڈھنگ کی بزنس شروع کر پائے۔ بنیادی طور پر وہ سیدھے آدمی تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ اپنے بندھے ٹکے اصولوں اور آوٹ آف ڈیٹ طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کو سراسر بدمعاشی گردانتے تھے۔ چنانچہ ناکامی سے دل گرفتہ یا شرمسار ہونے کی بجائے ایک گونہ افتخار و طمانیت محسوس کرتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی میں ناکام ہونے کو اپنی نیکی اور راست بازی کی سب سے روشن دلیل سمجھتے ہیں۔ بے حد حساس' کم آمیز اور خود دار انسان تھے۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ پامسٹ کے سامنے بھی نہیں۔ اب یہ بھی کیا' خوشامد سے زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا تھا۔ یہ قسم بھی ٹوٹی مگر کار برآری نہیں ہونی تھی' نہ ہوئی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ' جب غیور اور با اصول آدمی حتی المقدور دھکے کھانے کے بعد "ڈی موریلائز" ہو کر کامیاب لوگوں کے ہتھکنڈے اپنانے کی بھونڈی کوشش کرتا ہے تو رہی

سہی بات اور بگڑ جاتی ہے۔ یکایک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ ذیابیطس' الرجی' پارکن سن کا عارضہ اور اللہ جانے کیا کیا لاحق ہو گیا۔ کچھ نے کہا' ان کی مجروح انا نے بیماریوں میں پناہ تلاش کر لی ہے۔ خود تندرست نہیں ہونا چاہتے کہ پھر کوئی ترس نہیں کھائے گا۔ اب انہیں اپنی ناکامی کا اتنا ملال نہیں تھا جتنا کہ عمر بھر کی وضعداری کے ہاتھ سے چھوٹنے کا قلق۔ لوگ آ آ کر انہیں حوصلہ دلاتے اور کامیاب ہونے کی ترکیبیں سجھاتے تو ان کے آنسو رواں ہو جاتے۔

تم تو کرو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

بکی' بے وقری اور ذلت کی سب سے ذلیل صورت یہ ہے

کہ آدمی خود اپنی نظر میں بے وقعت و بے توقیر ہو جائے۔

سو وہ اس جہنم سے گزرے۔

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا

ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا

محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا

چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا

اس جان ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی

نالائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی

کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی

ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی

مشہور شہر اب ہوں سبک سار و بے وقار

بشارت بیان کرتے ہیں کب باوا جب "دست بدیوار" والا مصرع پڑھتے تو ہوا میں دائیں ہاتھ سے دیوار پکڑ پکڑ کر چلنے کی تصویر سی کھینچ دیتے۔ بایاں بے جان ہاتھ لٹکا الگ اپنی باتصویر کہانی سناتا۔ لیکن بے کسی اور بے بسی کی تصویر کھینچنے کے لیے انہیں کچھ زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ساری عمر داغ کی غزلوں پر سر دھنا کیے۔ انہوں نے کبھی کسی طوائف کو فانی یا میر کی غزل گاتے نہیں سنا۔ دراصل ان دنوں محفل رقص و سرود میں کسی شعلہ رو' شعلہ گلو سے فانی یا میر کی غزل گوانا ایسا ہی تھا جیسے شراب میں برابر کا نیبو کا رس نچوڑ کر پینا پلانا! گستاخی معاف' ایسی' مئے مرد افگن' پینے کے بعد تو آدمی صرف طبلہ بجانے کے لائق رہ جائے گا۔ تو صاحب' باوا ساری عمر فانی اور میرے نفور رہے۔ اب جو پناہ ملی تو انہیں کے ابیات میں ملی۔ وہ قوی اور بہادر آدمی تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی ان کو روتے ہوئے دیکھوں گا۔ مگر دیکھا۔ ان آنکھوں سے اکثر۔"

کراچی میں ان کا آدھا وقت تو یاران رفتہ کی یاد میں گزرتا تھا۔ بقیہ آدھا یاران ازکار رفتہ ضائع کر دیتے تھے۔

○ الہ دین ہشتم

بزرگوار کے امراض نہ صرف متعدد تھے بلکہ متعدی بھی۔ ان میں سب سے موذی مرض بڑھاپا تھا۔ ان کا ایک داماد ولایت سے سرجری میں تازہ تازہ ایف آر سی ایس کر کے آیا تھا۔ اس نے اپنی سسرال میں کسی کا اپنڈکس سلامت نہیں چھوڑا۔ کسی کی آنکھ میں بھی تکلیف ہوتی تو اس کا اپنڈکس نکال دیتا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی کہ آنکھ کی تکلیف جاتی رہتی تھی۔ بزرگوار حالانکہ تمام عمر درد شکم میں مبتلا رہے' لیکن اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہتے تھے کہ میں نے آج تک کسی ڈاکٹر کو اپنے اپنڈکس پر ہاتھ

نہیں ڈالنے دیا۔ ایک مدت سے صاحب فراش تھے۔ لیکن ان کی معذوری ابھی نامکمل تھی۔ مطلب یہ کہ سہارے سے چل پھر سکتے تھے۔ انہوں نے رسم افتتاح اس طرح ادا کی کہ اپنے کمرے کے دروازے میں جس سے نکلے انہیں کئی مہینے ہو گئے تھے' ایک سرخ ربن بندھوا کر اپنے ڈانواں ڈول ہاتھ سے قینچی سے کاٹی۔ تالی بجانے والے بچوں میں لڈو تقسیم کرنے کے بعد دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ پھر گھوڑے کو اپنے ہاتھ سے گیندے کا ہار پہنایا۔ اس کی پیشانی پر ایک بڑی سی بھونری تھی۔ زعفران میں انگلی ڈبو کر اس پر "اللہ" لکھا اور کچھ پڑھ کر دم کیا۔ چاروں سموں اور دونوں پہیوں شگون کے لیے سیندور لگا کر دعا دی کہ جیتے رہو' سدا سرپٹ چلتے رہو۔ رحیم بخش کوچوان کا منہ کھلوا کے اس میں سالم لڈو فٹ کیا۔ خود ورق نقرہ میں لپٹی ہوئی گلوری کلے میں دبائی۔ پرانی کشمیری شال اوڑھ لپیٹ کے تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اگلی سیٹ پر اپنا بیس سال پرانا ہارمونیم رکھوا کر اس کی مرمت کرانے ماسٹر باقر علی کی دکان روانہ ہو گئے۔

گھوڑے کا نام بدل کر بزرگوار نے بلبن رکھا۔ کوچوان سے کہا' ہمیں تمہارا نام رحیم بخش بالکل پسند نہیں۔ ہم تمہیں الہ دین کہہ کر پکاریں گے۔ جب سے ان کا حافظہ خراب ہوا تھا وہ ہر نوکر کو الہ دین کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ الہ دین ہشتم تھا۔ اس کا پیش رو الہ دین ہفتم کثیر العیال تھا۔ حقے کے تمباکو اور روٹیوں کی چوری میں نکالا گیا۔ گرم روٹیاں پیٹ پر باندھ کر لے جا رہا تھا۔ چال سے پکڑا گیا۔ بزرگوار موجودہ الہ دین یعنی رحیم بخش کو عام طور سے الہ دین ہی کہتے تھے۔ البتہ کوئی خاص مثلاً پیر دبوانے ہوں یا بے وقت چلم بھروانی ہو یا محض پیار اور شفقت جتانی ہو تو الہ دین میاں کہہ کر پکارتے۔ لیکن گالی دینی ہو تو اصل نام لے کر گالی دیتے تھے۔

○ ہاف ماسٹ چابک

دوسرے دن سے تانگہ صبح بچوں کو اسکول لے جانے لگا۔ اس کے بعد بشارت کو دکان چھوڑنے جاتا۔ تین دن یہی معمول رہا۔ چوتھے دن کوچوان بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آیا تو بے حد پریشان تھا۔ گھوڑا پھاٹک سے باندھ کر سیدھا بشارت کے پاس آیا۔ ہاتھ میں چابک اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے زمانہ قدیم میں علمبردار جنگی علم لے کر چلتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے' جس طرح نیویارک کے اسٹیچو آف لبرٹی نے اپنے ہاتھ کو آخری سینٹی میٹر تک اونچا کر کے مشعل آزادی بلند کر رکھی ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ کوئی بجوگ پڑ جائے یا منحوس خبر سنانی ہو تو وہ اسی طرح چابک کا علم بلند کئے آتا تھا۔ چابک کو عمودی حالت میں دیکھ کر بشارت ایسے سراسیمہ ہوتے جیسے ہیلمٹ Ghost دیکھ کر ہوتا تھا۔

Here it cometh, my lord!

بشارت کے قریب آ کر اس نے چابک کو "ہاف ماسٹ" کیا اور پندرہ روپے طلب کئے۔ کہنے لگا؟ "اسکول کی گلی کی نکڑ پہ اچانک چالان ہو گیا۔ گھوڑے کے بائیں پاؤں میں لنگ ہے! اسکول سے نکلا ہی تھا کہ "بے رحمی والوں" نے دھر لیا۔ بڑی منتوں سے پندرہ روپے دے کر گھوڑا چھڑایا ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ سرکار بھی بے فضول کھچے کھچے پھرتے۔ میری آنکھوں کے سامنے بے رحمی والے ایک گدھا گاڑی کے مالک کو چابک سے مارتے ہوئے ہنکال کے تھانے لے گئے۔ اس کے گدھے کا لنگ تو اپنے گھوڑے کا پاسنگ بھی نہیں۔" کوچوان نے گدھے کے خفیف سے لنگ کا ذکر اتنی حقارت سے کیا اور اپنے گھوڑے کے لنگ کی شدت اور برتری بیان کرنے میں اتنے فخر اور غلو سے کام لیا کہ بشارت نے غصے سے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پندرہ روپے دے کر اسے خاموش کیا۔

- شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور

اسی وقت ایک سلوتری کو بلا کر گھوڑے کو دکھایا۔ اس نے بائیں نلی ہاتھ سے سونتی تو گھوڑا چمکا۔ تشخیص ہوئی کہ پرانا لنگ ہے۔ سارا گھپلا اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔

غالباً کیا یقیناً اسی وجہ سے گھوڑا ریس میں ڈس کوالیفائی ہوا ہو گا۔ ایسے گھوڑے کو تو اسی وقت گولی مار دی جاتی ہے جو اس کے حق میں تانگے میں ذلیل و خوار ہونے سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ تاہم سلوتری نے امید دلائی کہ لنگ اس صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے تک حواصل کے تیل کی مالش کرائیں۔ مالش کی اجرت پانچ روپے یومیہ یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار' چھ مہینے کے نو سو روپے ہوئے۔ نو سو کا گھوڑا' نو سو کی مالش۔ گویا ٹاٹ کی گدڑی میں کمخواب کا پیوند! ابھی کچھ دن ہوئے انھوں نے اپنے والد کی مالش اور پیر دبانے کے لیے ایک شخص کو اسی روپے ماہوار پر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کی کمائی کا نصف حصہ تو انکم ٹیکس والے دھروا لیں گے اور ایک تہائی چمپی مالش والے کھا جائیں گے۔ حلال کی کمائی کے بارے میں انھوں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ وہ اس تناسب سے غیر مستحقین میں تقسیم ہوتی ہے۔

چار بجے تانگہ جتوا کر سیٹھ سے نمٹنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے انھوں نے گہرے رنگ کی دھوپ کی عینک لگا لی تا کہ سخت بات کہنے میں حجاب محسوس نہ ہو اور چہرے پر ایک پر اسرار خونخواری کا ایکسپریشن آ جائے۔ آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک شخص نے بم پکڑ کر تانگہ روک لیا۔ کہنے لگا' آپ کا گھوڑا بری طرح لنگڑا رہا ہے' چالان ہو گا۔ بشارت ہک دک رہ گئے۔ معلوم ہوا "بے رحمی والے" آج کل بہت سختی کر رہے ہیں۔ ہر موڑ پر ایک انسپکٹر گھات میں کھڑا ہے۔ قدم قدم پہ بات بے بات چالان ہو رہا ہے۔ وہ کسی طرح نہ مانا تو بشارت نے قانونی موشگافی کی' آج صبح ہی اس کا چالان ہو چکا ہے۔ سات گھنٹے میں ایک ہی جرم میں دو چالان نہیں ہو سکتے۔ انسپکٹر نے یہ بات بھی فرد جرم میں ٹانک لی اور کہا کہ اس سے تو جرم کی نوعیت اور سنگین ہو گئی۔ کوئی جائے فرار نظر نہ آئی تو بشارت نے کہا۔ "اچھا'

بابا! تمہیں سچے سہی، دس روپے پہ معاملہ رفع دفع کرو۔ برانڈ نیو گھوڑا ہے۔ خریدے ہوئے تیسرا دن ہے۔" یہ سنتے ہی وہ شخص تو آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "بڑے صاب! گاگلز

کے باوجود آپ بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پیسے سے لنگڑا گھوڑا خرید سکتے ہیں، آدمی نہیں خرید سکتے۔" چالان ہو گیا۔

اسٹیل ری رولنگ مل پہنچے تو سیٹھ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اس کے یہاں ایک بزرگ کی نیاز میں ڈیڑھ دو سو فقیروں کو پلاؤ کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس سے مہینے بھر کی کمائی پاک ہو جاتی ہے۔ اور یہ Laundering (شست و شو) کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک بینک میں پندرہ بیس برس تک یہ دستور رہا کہ ہر برانچ میں روزانہ جتنے نئے اکاؤنٹ کھلتے، شام کو اتنے ہی فقیر کھلائے جاتے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کھانا اکاؤنٹ کھلنے کی خوشی میں کھلایا جاتا تھا یا سودی کاروبار میں بڑھوتری کا کفارہ تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ ملتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس دن بینک کے مالکان میں سے ایک بہت سینئر سیٹھ انسپکشن پر آئے ہوئے تھے۔ شام کو برانچ میں مساوات کا یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس فقیروں کے ساتھ زمین پر اکڑوں بیٹھے پلاؤ کھا رہے ہیں اور فرداً فرداً ہر فقیر اور اس کے اہل و عیال کی عدم خیریت کی تفصیلات دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالودود بیگ کو غبارے پنکچر کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہماری ساری خوشی کرکری کر دی کہ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور ہے۔ محمود و ایاز کا ایک ہی صف میں بیٹھ کر پلاؤ کھانا بھی "آڈٹ اینڈ انسپکشن" کا حصہ ہے۔ سیٹھ صاحب دراصل یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کھانے والے اصلی فقیر ہیں یا مینجر نے اپنے یاروں، رشتے داروں کی پنگت بٹھا دی ہے۔

ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ ذکر اسٹیل مل والے سیٹھ کا تھا جو سات آٹھ سال سے کالے دھن کو ماہ بہ ماہ نیاز فاتحانہ کے لوبان کی دھونی سے پاک اور "وہائٹ" کرتا رہتا

تھا۔ نئی جادوئی چھڑی ایجاد ہونے میں ابھی کافی دیر تھی کہ ہمارے ذہین اور طباع وزیر خالی خزانہ اور ماہرین اقتصادیات تو اس زمانے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ لہٰذا سیاہ کو سفید کرنے کا شعبہ ہنوز پیر فقیر، نو سر باز، سفلی عامل اور باورچی خانے پر سفید کرنے والے انجام دیتے تھے۔

○ مہاتما بدھ بہاری تھے

سیٹھ نے گھوڑے کے لنگ سے قطعی لا علمی کا اظہار کیا۔ الٹا سر ہو گیا کہ "تم گھوڑے کو دیکھنے ہاف ڈزن ٹائم تو آئے ہو گے۔ گھوڑا تلک تم کو پچھاننے لگا تھا۔ دس دفعہ گھوڑے کے دانت گنے۔ کیا؟ تم ایک دفعہ اس کے لیے نان خطای بھی لائے۔ تم نے ہم کو یہاں تلک بولا کہ گھوڑا نو ہاتھ لمبا ہے۔ اس سے تمھیں یہ نوگزا دکھلائی پڑتا تھا۔ آج چار پانچ دن بعد گھوڑے کے گاگلز خود پہن کے بہتان طوفان لگانے آئے ہو' کیا؟ تین دن میں تو قبر میں مردے کا بھی حساب کتاب بروبر خلاص ہو جاتا ہے۔ اس ٹیم آپ کو مال میں یہ ڈیفکٹ دکھلائی نئیں پڑا۔ تانگے میں جوت کے غریب خانے

لے گئے تب بھی نجر نہیں آیا۔" بشارت سیٹھ کے سامنے اپنے گھر کو اتنی دفعہ غریب خانہ کہہ چکے تھے کہ وہ یہ سمجھا کہ یہ ان کے گھر کا نام ہے۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو قطع کلام کرتے ہوئے بولا۔ "ارے بابا! گھوڑے کا کوئی پارٹ کوئی پرزہ ایسا نہیں جس پہ تم نے دس دس دفعہ ہاتھ نہیں پھیرا ہو۔ کیا؟ تم برنس مین ہو کے ایسا کچی بات منہ سے نکالیں گا یا تو ہم کدھر کو جائیں گا؟ بولو نی! ہلکٹ مانس (گھٹیا آدمی) کے موافق بات نہیں کرو۔ کیا؟" سیٹھ بری الذمہ ہو گیا۔

بشارت نے زچ ہو کر کہا۔ "حد تو یہ کہ سودا کرنے سے پہلے یہ بھی نہ بتایا کہ گھوڑا جنازہ الٹ چکا ہے۔ آپ خود کو مسلمان اور پاکستانی کہتے ہیں!"

(سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) "تو کیا تمہارے کو بدھسٹ دکھلائی پڑتا ہوں؟ ہم نے جونا گڑھ کاٹھیا واڑ سے مائی گریٹ کیا ہے۔ کیا؟ اپنے پاس برو بر سندھ کا ڈومیسائل ہے۔ مہاتما بدھ تو بہاری تھا۔ (اپنے منہ میں پان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میرے منہ میں رزق ہے۔ تم بھی بچوں کی قسم کھا کے بولو۔ جب تم سے پوچھا گھوڑا کائے کو بیچ رہے ہو' ہم نے پھی الپھور (فی الفور) بول دیا۔ سودا پکا کرنے سے پہلے پوچھتے تو ہم پہلے بول دیتے۔ تم لکڑی بیچتے ہو تو کیا گراہک کو لکڑی کی ہر گانٹھ' ہر داغ پہ انگلی رکھ رکھ کے بتاتے ہو کہ پہلے اسے دیکھو؟ ہم سالا اپنا بج بیوپار کرے کہ تمہارے کو گھوڑے کی بیاگرابھی (بائیو گرافی) بتائے۔ فادر میرے کو ہمیش بولتا تھا کہ گراہک ۴۲۰ ہو تو پہلے دیکھو بھالو۔ پھر سودے کی ٹیم بولو کم' تولو زیادہ۔ پر تمہارے اوپر تو کھولو' ابھی کھولو' کی دھن سوار تھی۔ تمہارے منہ میں پیسے بج رہے تھے۔ گجراتی میں کہاوت ہے کہ پیسہ تو شیرنی کا دودھ ہے۔ اسے حاصل کرنا اور ہجم کرنا دونوں برو بر مسکل ہیں۔ پر تم تو سالا شیر کو ہی دوہنا مانگتا ہے۔ ہم کروڑوں کا بجنس کریلا ہے۔ آج دن تلک جبان دے کے نئیں پھریلا۔ اچھا' اگر تم قرآن اٹھا کے بول دو کہ تم گھوڑا خریدتے ٹیم پئے لا (پیئے ہوئے) تھا تو ہم فوراً ایک ایک پائی ری پھنڈ (ری فنڈ) کر دیں گا۔"

بشارت نے گڑگڑاتے ہوئے درخواست کی۔ "سیٹھ' سو ڈیڑھ سو کم میں گھوڑا واپس لے لو' میں عیال دار آدمی ہوں تا عمر ممنون و احسان مند رہوں گا۔"

سیٹھ آپے سے باہر ہو گیا۔ "ارے بابا! خچر کے موافق ہم سے اڑی نئیں کرو' ہم سے ایک دم کڑک اردو میں ڈائیلاگ مت بولو۔ تم پھلم کے ولن کے موافق گاگلز لگا کے ادھر کائے کو تڑی دیتا پڑا ہے۔ بھائی صاحب! تم پڑھیلا مانس ہو' کوئی پھڈے باز موالی' ملباری نئیں جو شریفوں سے دادا گیری کرے۔ تم نے سائن بورڈ نئیں پڑھا۔ بابا یہ ری رولنگ مل ہے' اسٹیل ری رولنگ مل۔ ادھر گھوڑوں کا دھندا نئیں ہوتا۔ کیا؟ کل کو تم بولیں گا کہ تانگہ بھی واپس لے لو۔ ہم سالا اکھا (تمام) عمر ادھر بیٹھا گھوڑے

تانگے کا دھندا کریں گا تو ہمارا فیملی پریوار کیا گھر میں بیٹھا قوالی کریں گا؟ بھائی صاحب! اپن کا گھر تو گرہستیوں کا گھر ہے۔ کسی بجرگ کا مجار نہیں کہ بائی لوگ گج گج بھر لمبے بال کھولے دھمال ڈال دیں۔ دھما دھم مست قلندر"

بشارت نے تانگہ اسٹیل ری رولنگ مل کے باہر کھڑا کر دیا اور خود ایک تھڑے پر پیر لٹکائے انتظار کرنے لگا کہ اندھیرا ذرا گہرا ہو جائے تو واپس جائیں تا کہ نو گھنٹے میں تیسری مرتبہ چالان نہ ہو۔ غصے سے ابھی تک ان کے کان کی لویں تپ رہی تھیں اور حلق میں کیکٹس اگ رہے تھے۔ بلبن گولڈ مہر کے پیڑ سے بندھا سر جھکائے کھڑا تھا۔ انہوں نے پان کی دکان سے ایک لیمونڈ کی گولی والی بوتل خریدی۔ ایک ہی گھونٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے انتظار میں یہ بوتل کئی مہینوں سے دھوپ میں تپ رہی تھی۔ پھر یک لخت یاد آیا کہ اس افراتفری میں آج دوپہر بلبن کو چارا اور پانی بھی نہیں ملا۔ انہوں نے بوتل ریت پر انڈیل دی۔ اور گاگلز اتار دیئے۔

○ باوجود دھر لیا

تانگہ لشتم پشتم چلتا رہا۔ رحیم بخش اس کے بعد تین چار دفعہ اور دھر لیا گیا لیکن بات سات آٹھ روپے پر ٹل گئی۔ دس پندرہ دن کا بھلاوا دے کر ایک دن پھر چابک بلند کئے آیا۔ کہنے لگا۔ "سرکار! باوجود دھر لیا۔ ہر چند کہ آج میرے پاس نانواں نہیں تھا' مگر بہت منہ پھاڑ ریا ہے۔ پچیس مانگتا ہے۔ چنانچہ تانگہ اس کے پاس گروی رکھ کے آ ریا ہوں۔ اگرچہ بچے تانگے میں بمعہ گھوڑے کے ہیں۔ آپ ہر دفعہ سمجھتے ہیں کہ رحیم بخس ڈریامہ کھیل ریا ہے۔ چنانچہ خود چل کے چھڑا لیجئے۔ اگرچہ زحمت......"

بشارت اس وقت اکڑوں بیٹھے ایک ڈھیلے تختے کی گرہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ یک لخت بھڑک کے اٹھ کھڑے ہوئے اور تو کسی پہ بس چلا نہیں' بری خبر لانے والے کے ہاتھ سے چابک چھین کر اسے تڑ سے زمین پر مارتے ہوئے کہنے لگے۔ "ہرچند کے بچے!

اگر تو نے آئندہ میرے سامنے باوجود' اگرچہ اور چنانچہ کیا تو اسی چابک سے چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

دوران سرزنش رحیم بخش نے یکایک اپنا بایاں کان ہلایا تو بشارت کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ غصے کو لاحول اور ایک گلاس پانی سے بجھا کر' چابک ہاتھ میں لیے وہ رحیم بخش کے ساتھ ہو لیے کہ آج جھوٹے کو گھر تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ جائے واردات پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک "بے رحمی والا" سچ مچ گھوڑے کی راس تھامے کھڑا ہے۔ بچے گلے میں بستے اور تھرمس لٹکائے' دھوپ میں سہمے کھڑے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے خون کی کھولن یکبارگی نقطہ انجماد پر اتر آئی۔ گلے میں اون کا گولا سا اٹکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ چابک کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ "بے رحمی والے" کو علیحدہ لے جا کر انہوں نے رحم کی اپیل کی۔ اور اپنے مخصوص دکاندارانہ انداز میں اس پہلو پر بھی توجہ دلائی کہ ہم تو آپ کے مستقل کلائنٹ ہیں' اٹھاؤ چولہا پاونڈے نہیں کہ آج ہیں کل نہیں۔ اس نے بیس روپے کا ڈسکاؤنٹ دے کر صرف پانچ روپے میں معاملہ رفع دفع کر دیا۔

اسی اثناء میں "بے رحمی کا ہفتہ" جو اکیس دن تک منایا گیا' شروع ہو گیا۔ جب تک وہ بلا خیر و خوبی ختم نہ ہو گیا' گھوڑا' سلوتری اور رحیم بخش تینوں بالترتیب بندھے' کھڑے اور چھٹے کھاتے رہے۔ رحیم بخش کو گھوڑے کے ساتھ بریکٹ کرنا یوں بھی ضروری ہو گیا کہ اس کی خوراک گھوڑے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گھوڑے کو تو خیر تیسرے چوتھے روز بد ہضمی ہوتی رہتی تھی لیکن رحیم بخش کا نظام ہضم نہ صرف ہر قسم کے بیکٹریا سے بلکہ مقدار سے بھی Immune ہو گیا تھا۔ نئے Pet' نئی نویلی دلہن اور لاڈلے بچے کے ساتھ شفقت کا اظہار کرنے کا ہمارے ہاں لے دے کے ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص انہیں کچھ نہ کچھ کھلا کر اوور فیڈ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ گھوڑے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نتیجتاً اسے بار بار رچمنڈ کرافورڈ ہاسپٹل (جانور کا اسپتال) بھیجنا

پڑتا۔ بشارت کا بیان ہے کہ ایک دن شام کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رحیم بخس گھوڑے کے جلاب کا سارا پاؤڈر پھنکے مار کے کھا گیا۔

"ہفتہ" ختم ہوتے ہی بچوں کو پھر تانگے میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ان کی اپنی دکان زیادہ دور نہیں تھی' لہٰذا پیدل چلے جاتے تھے۔ تین ہفتے خیریت سے گزرے۔ مطلب یہ کہ گھوڑے کا لنگ بڑھ گیا' مگر چالانوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چوتھا ہفتہ شروع ہی ہوا تھا کہ رحیم بخش چابک کا علم اٹھائے' آہ و بکا کرتا' بائیں ٹانگ سے لنگڑاتا آیا۔ گھوڑے کی دیکھا دیکھی اب وہ بائیں ٹانگ سے لنگڑانے لگا تھا۔ کہنے لگا۔ "سرکار! آج پھر دھر لیا۔ آگاہ کیئے بغیر ناگاہ دھر لیا۔ چنانچہ بیس روپے بھر کے آ رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے بتیرے ٹھڈی میں ہاتھ دیے۔" بشارت نے بادست ناخواستہ بیس روپے اس کے منہ پر مارے۔ اب جو تابڑ توڑ چالان ہونے شروع ہوئے تو چوٹ سہلانے تک کی مہلت نہ ملی۔ انھوں نے رحیم بخش کو سختی سے ہدایت کی کہ چھپ چھپا کر راستے بدل بدل کر' گلیوں گلیوں جایا کرے۔ اس وضع احتیاط میں اس نے اپنی طرف سے اتنا اضافہ اور کر لیا کہ خود بھی چھپ کر یعنی سر سے پیر تک ایک لال کھیس اوڑھ کے تانگہ چلانے لگا۔ گھونگھٹ میں سے صرف اس کا سگریٹ باہر نکلا رہتا تھا۔ لیکن اس سے واقعی بڑا فرق پڑا۔ وہ اس طرح کہ انسپکٹر اب گھوڑے کو پہچانے بغیر ہی دور سے صرف لال کھیس دیکھ کر چالان کر دیتا تھا۔

○ بزرگوار کی حکمت عملیات

رشوت اور مالش کی مجموعی رقم اب گھوڑے کی قیمت اور ان کی قوت برداشت سے تجاوز کر چکی تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ عاجز آ کر انھوں نے رحیم بخش کی زبانی انسپکٹر کو یہ تک کہلایا کہ تم میری دکان میں اگاہی کے کام

پر ملازم ہو جاؤ۔ موجودہ تنخواہ سے زیادہ دوں گا۔ اس نے کہلا بھیجا۔ "سیٹھ کو میرا سلام بولنا اور کہنا کہ ہم تین ہیں۔"

انہوں نے گھوڑا تانگہ بیچنا چاہا تو کسی نے سو روپے بھی نہ لگائے۔ بالآخر اس پریشانی کا ذکر اپنے والد بزرگوار سے کیا۔ انہوں نے احوال سن کر فرمایا۔ "اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم دعا کریں گے۔ تانگے میں جوتنے سے پہلے ایک گلاس دم کیا ہوا دودھ پلا دیا کرو۔ اللہ نے چاہا تو لنگ جاتا رہے گا اور چالانوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ ایک دفعہ وظیفے کا اثر تو دیکھو۔"

بزرگوار نے اسی وقت رحیم بخش سے بستر پر ہارمونیم منگوایا۔ وہ دھونکنی سے ہوا بھرتا رہا اور بزرگوار کانپتی' کپکپاتی آواز میں حمد گانے لگے۔

ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا' تری شان جل جلالہ'

تری شان جل جلالہ'

آنکھ جہاں پڑتی وہاں انگلی نہیں پڑ رہی تھی۔ اور جس پردے پر انگلی پڑتی' اس پر پڑی ہی رہ جاتی۔ ایک مصرع گانے اور بجانے کے بعد یہ کہہ کر لیٹ گئے کہ اس ہارمونیم کے کالے پردوں کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ ماسٹر باقر علی نے خاک مرمت کی ہے۔

دوسرے دن بزرگوار کی چارپائی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس لیے کہ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جہاں گھوڑا علی الصبح اپنے ماتھے پر "اللہ" لکھوانے اور دم کروانے کے لیے اندر لایا جا سکتا تھا۔ صبح تڑکے بزرگوار نے دو نفلوں کے بعد عرق گلاب میں انگلی ڈبو کر گھوڑے کی پیشانی پر اللہ لکھا اور سموں کو لوبان کی دھونی دی۔ کچھ دیر بعد اس پر ساز کسا جانے لگا تو بشارت دوڑے دوڑے بزرگوار کے پاس آئے اور کہنے لگے' گھوڑا دم کا دودھ نہیں پی رہا۔ بزرگوار متعجب ہوئے۔ پھر آنکھیں بند کرکے سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں بعد انہیں نیم وا کر کے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ کوچوان کو پلا دو۔ گھوڑا وجع الانسان میں مبتلا ہے۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ دم کا دودھ رحیم بخش نوش جان کرنے لگا۔ بظاہر ایسی کراہت سے پیتا جیسے اس زمانے میں یونانی دواؤں کے قدحے پیئے جاتے

تھے۔ یعنی ناک پکڑ کے، منہ بنا بنا کے۔ اللہ شافی! اللہ شافی! (نعوذ باللہ) کہتا جاتا۔ دودھ کے لیے نہ جانے کہاں سے دھات کا بہت لمبا گلاس لے آیا جو اس کی ناف تک پہنچتا تھا۔ بزرگوار کی عملیاتی تدابیر کا اثر پہلے ہی دن ظاہر ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اس دن چالان ایک داڑھی والے نے کیا۔ رحیم بخش اپنا لہراتا ہوا چابک ہاف ماسٹ کر کے کہنے لگا۔ "سرکار، باوجود دھر لیا۔" پھر اس نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ ایک داڑھی والا آج ہی جمشید روڈ کے حلقے سے تبدیل ہو کے آیا ہے۔ بڑا ہی رحمدل، اللہ والا آدمی ہے۔ چنانچہ صرف ساڑھے تین روپے لیے۔ وہ بھی بطور چندہ۔ پڑوس میں ایک بیوہ کے بچے کے علاج کے لیے۔ آپ چاہیں تو چل کے ملاقات کر لیں۔ مل کے بہت خوش ہوں گے۔ ہر وقت منہ ہی منہ میں وظیفہ پڑھتا رہتا ہے۔ اندھیری رات میں سجدے کے گٹے سے ایسی روشنی نکلتی ہے کہ سوئی پرو لو۔ (اپنے بازو سے تعویذ کھولتے ہوئے) گھوڑے کے لیے یہ تعویذ دیا ہے۔

کہاں پچیس روپے، کہاں ساڑھے تین روپے! بزرگوار نے رشوت میں کمی کو اپنے وظیفے اور کشف و کرامات پر محمول کیا اور فرمایا کہ تم دیکھتے جاؤ۔ انشاء اللہ چالیسویں دن "بے رحمی" کے انسپکٹر کو گھوڑے کی ٹانگ نظر آنی بند ہو جائے گی۔ بزرگوار کی چارپائی کے گرد ان کا ساز و سامان بھی ڈرائنگ روم میں قرینے سے سجا دیا گیا۔ دوائیں، بیڈ پین، حقہ، سلفچی، ہارمونیم، آغا حشر کے ڈرامے، مولانا آزاد کے "الہلال" کے مجلد فائل، انیما کے آلات اور کجن ایکٹرس کی تصویر۔ ڈرائنگ روم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس میں گھوڑے اور بزرگوار اور ہر دو کا فضلہ اٹھانے والی مہترانی کے علاوہ کوئی اور پانچ منٹ بھی ٹھہر سکے۔ بشارت کے دوستوں نے آنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ گھوڑے کی خاطر بزرگوار کو برداشت کر رہے تھے۔

○ ایک گھوڑا بھرے گا کتنے پیٹ؟

جس دن سے داڑھی والے مولانا تعینات ہوئے‘ رحیم بخش ہر چوتھے پانچویں دن آ کے سر پہ کھڑا ہو جاتا۔ "چندہ دیجیے۔" لیکن ڈھائی تین روپے یا زیادہ سے زیادہ پانچ میں آئی بلا ٹل جاتی۔ اس سے جرح کی تو معلوم ہوا کہ کراچی میں تانگے اب صرف اسی علاقے میں چلتے ہیں۔ تانگے والوں کا حال گھوڑوں سے بھی خستہ ہے۔ انھوں نے پولیس اور بے رحمی والوں کا برائے نام ماہانہ باندھ رکھا ہے جو ان کی گزر بسر کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ادھر ننگے بھوکے گدھا گاڑی والے مکرانی سر پھاڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ زخمی گدھا‘ پسینے میں شرابور گدھا گاڑی والا اور پھٹے حالوں "بے رحمی" کا انسپکٹر -------- یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں کون زیادہ خستہ اور مظلوم ہے۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے ایک سوکھی بھوکی جونک دوسری سوکھی بھوکی جونک کا خون پینا چاہے۔ نتیجہ یہ کہ بے رحمی والے پو پھٹے ہی اکلوتی موٹی اسامی یعنی ان کے تانگے کے انتظار میں گلی کی نکڑ پہ کھڑے ہو جاتے اور اپنے پیسے کھرے کر کے چل دیتے۔ اکیلا گھوڑا سارے عملے کے بال بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ لیکن کرامت حسین (داڑھی والے مولانا کا یہی نام تھا) کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ اپنے حلیے اور پھٹے حالوں سے اتنے مسکین لگتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا گویا انہیں رشوت دینا کار ثواب ہے اور وہ رشوت لے کر در حقیقت رشوت دینے والے کو داخل حسنات کر رہے ہیں۔ وہ رشوت مانگتے بھی خیرات ہی کی طرح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سارا رزق اس گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ کے توسل سے نازل ہوتا ہے۔ ایسے پھٹیچر رشوت لینے والے کے لیے ان کے دل میں نہ کوئی ہمدردی تھی نہ خوف۔

○ کتوں کے چال چلن کی چوکیداری

احباب نے مشورہ دیا کہ گھوڑے کو رچمنڈ کرافورڈ ہاسپٹل میں انجکشن سے ٹھکانے لگوا دو۔ لیکن ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ بزرگوار تو سنتے ہی روہانسے ہو گئے۔ کہنے لگے‘ آج

لنگڑے گھوڑے کی باری ہے کل اپاہج باپ کی ہو گی۔ شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلہن اور جانور تو مر کر ہی نکلتے ہیں۔ وہ خود تین دلہنوں کے جنازے نکال چکے تھے، اس لیے گھوڑے کے بارے میں بھی ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ رحیم بخش بھی گھوڑے کو ہلاک کرانے کے سخت خلاف تھا۔ جیسے ہی ذکر آتا، اپنے تیس سالہ تجربات بیان کرنے بیٹھ جاتا۔ یہ تو ہم نے بھی سنا تھا کہ تاریخ در حقیقت بڑے لوگوں کی بائیوگرافی ہے۔ لیکن رحیم بخش کوچوان کی ساری آٹو بائیوگرافی دراصل گھوڑوں کی بائیوگرافی تھی۔ اس کی زندگی سے ایک گھوڑا پوری طرح نکل نہیں پاتا تھا کہ دوسرا داخل ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ اس کے تین سابق آقاؤں نے "ویٹ" سے گھوڑوں کو زہر کے انجکشن لگوائے تھے۔ پہلا آقا تین دن کے اندر اندر چٹ پٹ ہو گیا۔ دوسرے کا چہرہ لقوے سے ایسا ٹیڑھا ہوا کہ دائیں باچھ کان کی لو سے جا ملی۔ ایک دن غلطی سے آئینے میں خود پر نظر پڑ گئی تو گھگھی بندھ گئی۔ تیسرے کی بیوی جا کی کے ساتھ بھاگ گئی۔ دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا جائے تو ان تینوں میں جو فوراً مر گیا، اسی کا انجام نسبتاً باعزت معلوم ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک سائیس خبر لایا کہ لاڑکانہ میں ایک گھوڑی تیلیا کمیت بالکل مفت تین سو روپے میں مل رہی ہے۔ بس وڈیرے کے دل سے اتر گئی ہے۔ گنے کی فصل کی آمدنی سے اس نے گنے ہی سے لمبائی ناپ کر ایک امریکی کار خرید لی ہے۔ آپ کی صورت پسند آ جائے تو ممکن ہے مفت ہی دے دے۔ اس کی مخالفت پہلے ہم نے اور بعد میں بزرگوار نے کی۔ ہمیں ان دنوں کتے پالنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ہر بات انہی کے حوالے سے کرتے تھے۔ کتوں کے لیے من الجنس ہمارے دل میں دفعتہ اتنا احترام پیدا ہو گیا تھا کہ کتیا کو مادہ کتا کہنے لگے تھے۔ ہم نے بشارت کو سمجھایا کہ خدارا! مادہ گھوڑا نہ خریدو۔ عامل کالونی میں دستگیر صاحب نے ایک مادہ کتا پال لیا ہے۔ کسی خیر خواہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ جس گھر میں کتے ہوں، وہاں فرشتے، بزرگ اور چور نہیں آتے۔ اس ظالم نے یہ نہ بتایا کہ پھر صرف کتے آتے ہیں۔ اب سارے

شہر کے بالغ کتے ان کی کوٹھی کا محاصرہ کئے پڑے رہتے ہیں۔ عفیفہ خود غنیم سے ملی ہوئی ہے۔ ایسی تن داتا نہیں دیکھی۔ جو بوائے اسکاوٹ کا "ماٹو" ہے وہی اس کا Be Prepared۔ مطلب یہ کہ ہر حملہ آور سے تعاون کے لیے ہمہ تن تیار رہتی ہے۔ پھاٹک کھولنا ناممکن ہو گیا ہے۔ خواتین نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ مرد اسٹول رکھ کے پھاٹک اور کتے پھلانگتے ہیں۔ دستگیر صاحب ان کتوں کو دونوں وقت باقاعدگی سے راتب ڈلواتے ہیں تا کہ آنے جانے والوں کی پنڈلیوں کے بوٹوں سے اپنا پیٹ نہ بھریں۔ ایک دفعہ راتب میں زہر ڈلوا کر بھی دیکھ لیا۔ گلی میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اپنے خرچ پر ان کی تدفین کروائی۔ ایک صاحب کا پالتو کتا جو صحبت بد میں پڑ گیا تھا' اس رات گھر والوں کی نظر بچا کر تماش بینی کرنے آیا۔ وہ بھی وہیں کھیت رہا۔ ان جید کتوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ اسی طرح پر ہوا' جس طرح ادب اور سیاست میں پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اس تیزی سے پر کیا کہ خلا بالکل ناکافی ثابت ہوا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ خود کو Indispensable یعنی بے مثل و بے بدل سمجھنے والوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوتا وہ در حقیقت صرف دو گز زین میں ہوتا ہے جو انہیں کے جسد خاکی سے اسی وقت پر ہو جاتا ہے۔ خیر یہ علیحدہ قصہ ہے۔ کہنا یہ تھا کہ اب دستگیر صاحب سخت پریشان ہیں۔ "پیڈگ ری" (خاندانی) مادہ ہے۔ پنچ ذات کے کتوں سے شجرہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے تو دستگیر صاحب سے کہا تھا کہ ان کی توجہات Divert کرنے کے لیے کوئی معمولی ذات کی کتیا رکھ لیجئے تا کہ کم از کم یہ دھڑکا تو نہ رہے۔ راتوں کی نیند تو حرام نہ ہو۔ تاریخ میں آپ پہلے آدمی ہیں جس نے کتوں کے چال چلن کی چوکیداری کا بیڑا اٹھایا ہے۔

○ مونس تنہائی

اس قصے سے ہم نے انہیں عبرت دلائی۔ بزرگوار نے دوسرے پینترے سے گھوڑی خریدنے

کی مخالفت کی۔ وہ اس پر بہت برافروختہ ہوئے کہ بشارت کو ان کے کراماتی وظیفے پر یقین نہیں۔ وہ خاصے گلیر تھے۔ بیٹے کو کھل کر تو گالی نہیں دی' بس اتنا کہا کہ اگر تمہیں اپنی نسل چلانے کے لیے پیڈگ ری گھوڑی ہی رکھنی ہے تو شوق سے رکھو' مگر میں ایسے گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ جہاں بلبن گھوڑا جائے گا' وہ بھی جائیں گے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ بزرگوار اور گھوڑا ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہو چکے تھے کہ اگر گھر والے مانع نہ ہوتے تو وہ اسے ڈرائنگ روم میں اپنی چارپائی کے پائے سے بندھوا کر سوتے۔ وہ بھی ان کے قریب آ کر خود بخود سر نیچا کر لیتا تا کہ وہ اسے بیٹھے بیٹھے پیار کر سکیں۔ وہ گھنٹوں منہ سے منہ بھڑائے اس سے گھر والوں اور بہوؤں کی شکایتیں اور برائیاں کرتے رہتے۔ بچوں کے لیے وہ زندہ کھلونا تھا۔ بزرگوار کہتے تھے جب سے یہ آیا ہے میرے ہاتھ کا رعشہ کم ہو گیا ہے۔ اور برے خواب آنے بند ہو گئے۔ وہ اب اسے بیٹا کہنے لگے تھے۔ سدا روگی سے اپنے پرائے سب اکتا جاتے ہیں۔ ایک دن وہ چار پانچ گھنٹے درد سے کراہتے رہے۔ کسی نے خبر نہ لی۔ شام کو اختلاج اور مایوسی زیادہ بڑھی تو خانساماں سے کہا کہ بلبن بیٹے کو بلاؤ۔ بڑھاپے اور بیماری کے بھیانک سائے میں یہ دکھی گھوڑا ان کا واحد ساتھی تھا۔

○ ایک لقمہ تر کی صورت

گھوڑے کو جوت نہیں سکتے' بیچ نہیں سکتے' ہلاک نہیں کروا سکتے' کھڑے کھلا نہیں سکتے۔ پھر کریں تو کیا کریں۔ جب بلیک موڈ آتا تو اندر ہی اندر کھولتے اور اکثر سوچتے کہ سیٹھ' سرمایہ دار' وڈیرے' جاگیردار اور بڑے افسر اپنی شقاوت اور کرپشن کے لیے زمانے بھر میں بدنام ہیں۔ مگر یہ "بے رحمی والے" دو ٹکے کے آدمی کس سے کم ہیں۔ انہیں اس سے پہلے ایسے رجعتی اور غیر انقلابی خیال کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کی سوچ میں

ایک مردم گزیدہ کی کلبیت اور جھنجلاہٹ در آئی۔ یہ لوگ تو غریب ہیں' مظلوم ہیں مگر یہ کس کو بخشتے ہیں؟ سنتری بادشاہ بھی تو غریب ہے۔ وہ ریڑھی والے کو کب بخشتا ہے؟ اور غریب ریڑھی والے نے کل شام آنکھ بچا کر ایک سیر سیبوں میں دو داغ دار سیب ملا کر تول دیئے۔ اس کی ترازو صرف ایک چھٹانک کم تولتی ہے' صرف ایک چھٹانک۔ اس لیے کہ ایک من کم تولنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر لائق صد رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے چیتھڑے لٹکائے ظالم سماج کو کوستے پھرتے ہیں۔ انہیں ساڑھے چار سو روپے کھلائے جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور رحیم بخش کوچوان سے زیادہ مسکین کون ہو گا؟ ظلم' ظالم اور مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پہیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اژدھا سالم نگلتا ہے۔ شارک دانتوں سے خونم خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چبا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی' چھپکلی' مکڑی اور مچھر سب حسب مقدور و مقدار خون کی چسکی لگاتے ہیں۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ معاً انہیں اپنے انکم ٹیکس کے ڈبل بل ہی کھاتے یاد آ گئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیئے۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا ازوقہ ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

تب نظر آتی ہے اک لقمہ تر کی صورت